



رقص اجلہ

محی الدین خواب

موت برحق ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں۔ ہر انسان کی موت کا ایک وقت اور دن معین ہے۔ اور وہ انداز بھی جس سے گزر کر اسے اپنی زندگی کا سفر اختتام کرنا ہوتا ہے۔ جہد و جہاد آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی یہ کہانی اپنے اندر زندگی اور موت کے ان گنت متاظر سموئے ہوئے ہے۔ جسے آپ کے محبوب قلم کار محی الدین خواب نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا ہے۔ خواب صاحب کا قلم جب انسانی جذبات و احساسات کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے رواں ہوتا ہے تو صفحہ قرطاس پر موتیوں کی لڑیاں پروتا چلا جاتا ہے۔ کشمیر جنت نظیر کی سرزمین پر انڈین آرمی کے ظلم و ستم اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ پوری دنیا اس تشدد مسلسل سے آگاہ ہو چکی ہے۔ وادی کشمیر میں ہر وقت رقص اجل جاری ہے اور فرزند ان قویہ کی شہادت کا سلسلہ خدا جانے کب رُکے گا۔ زندگی اور موت کی دھوپ چھاؤں میں سفر کرتی یہ کہانی آپ کو جھنجھوٹ کر رکھ دے گی اور آپ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

محمد سجاد بھٹو 03045503086

دل کی آنکھوں اور آنکھوں کی زبان سے بڑھی جانے والے ایک ولولہ انگیز تحریر

تھے۔ کبھی رات کو واپس آتے تھے۔ کبھی دو چار دنوں تک شہر میں ہی رہ جاتے تھے۔ اس گاؤں میں تقریباً سو مکانات تھے۔ وہاں بھی رہنے والے زندگی کو پہاڑ کی طرح کاٹ رہے تھے۔ ایک تو مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ اوپر سے جوان لڑکیاں بھی پہاڑ بن جاتی تھیں۔ گاؤں کے جوان مزدوری کے لیے شہر جاتے تھے۔ شہر والے انہیں پھانس لیتے تھے یا تو وہ شادیاں کر لیتے تھے یا شہر میں موج مستی کر کے چلے آتے تھے۔ گاؤں میں شادیاں کر کے بال بچوں کی مصیبتیں جھیلنا نہیں چاہتے تھے۔

بھارتی فوجی ہر دو سرے تیسرے دن ادھر آیا کرتے تھے۔ کبھی گھروں کی تلاشیاں لیا کرتے تھے۔ کبھی مخبروں سے معلوم کرتے تھے کہ وہاں کسی نے کسی مجاہد کو پناہ تو نہیں دی ہے؟

اکثر مجاہدین لائن آف کنٹرول پار کر کے مختلف علاقوں میں جا کر چھپتے تھے۔ اس گاؤں کی طرف بھی آتے تھے۔ وہاں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ہندو مخبری کرتے تھے کہ اس بستی میں کوئی اجنبی آیا تھا پھر کہیں گم ہو گیا تھا۔

ایسے اجنبیوں کو وہاں کے مسلمان یا تو پناہ دیتے تھے یا پھر اس گاؤں سے دور انہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دیتے تھے۔

مون سون ہوائیں چل رہی تھیں۔ یہ سرد ہوائیں ہزار جتن کے باوجود ہڈیوں میں اتر رہی تھیں۔ غضب کی سردی تھی۔ شاداب سر سے پاؤں تک گرم کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ بستر کے پاس انگلیٹھی میں انگارے دبک رہے تھے۔ اس کا چہرہ کشمیری سیب کی طرح سرخ تھا۔ انگلیٹھی کی آگ اس کے چہرے کو اور سرخ بنا رہی تھی۔ آگ کے قریب بیٹھنے کے باوجود سردی لگ رہی تھی اور اس سردرات کی تاریکی میں اسے باہر جانا تھا۔

ماں نے اسے کھانا کھانے کو کہا تھا لیکن وہ کبل سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ باپ نے کہا ”سردی تو اور بڑھے گی اور تو تو برف باری میں بھی باہر نکل جایا کرتی ہے۔ آج تجھے کیا ہوا ہے؟“

آج وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ ماں باپ کو گہری نیند سلا کر گھر سے جانا تھا۔ جنہوں نے پیدا کیا، پال پوس کر جوان کیا۔ انہیں چھوڑ کر جانا تھا۔

وہ سوچتی تھی۔ یہ پہاڑ جیسی زندگی ان پہاڑوں کے درمیان رہ کر کیسے گزرے گی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی مستقل روزی کا ذریعہ نہیں تھا۔ باپ اور بھائی وہاں سے بیس میل دور سری نگر جاتے تھے شہر میں مزدور، کرتے



فصوصی ینکش: داسوسی نقشینه ایڈیتر

بنیے کے مکان میں رہے گا۔ وہاں سے اسے سری نگر لے جائے گا۔

وہ سلگتی ہوئی انگلیٹھی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے سردی سے کانپا چاہیے تھا مگر وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ پہلی بار ایسا قدم اٹھا رہی تھی... جس سے ماں باپ کی ذلت ہو سکتی تھی۔ بعد میں انہیں ماننا پڑا کہ وہ عزت سے ہے۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ جو بھی ہوتا بعد میں دیکھا جاتا۔ ابھی نوجوانی کے جوش میں وہ گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

آدھی رات کے بعد باپ کے خزانے سنائی دینے لگے۔ وہ کچھ بیمار تھا۔ اس لیے شہر نہیں گیا تھا۔ بھائی مزدوری کے لیے گیا تھا۔ دو چار دن بعد آنے والا تھا۔ اس نے چھوٹی سی کھڑکی سے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ بوڑھے والدین کمرے میں لیٹے ہوئے سو رہے تھے۔ اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا۔ اپنے بستر سے اونی شال اٹھا کر اسے بدن سے لپیٹ کر دبے قدموں چلتے ہوئے دروازے کے پاس آئی پھر اسے آہستگی سے کھول کر باہر نکل گئی۔

اندھیری رات تھی۔ رات کے پچھلے پہر چاند نکلنے والا تھا۔ وہ تاریکی میں چھپی ہوئی جانے لگی۔ ایک تو مون سون ہوائیں چل رہی تھیں پھر تھوڑی دیر پہلے بارش بھی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے سردی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ اونی شال اچھی طرح لپیٹے ہوئے جا رہی تھی۔ بستی کے مکانات پہاڑی کے نشیب و فراز میں دور دور بنے ہوئے تھے۔ کوئی اس کی آہٹ نہیں سن سکتا تھا اور نہ ہی اندھیری رات میں کوئی اسے دیکھ سکتا تھا۔

ایک ٹیلے کے پاس اچانک ہی کسی نے چھلانگ لگائی۔ اس کے سامنے پہنچ کر گرتے گرتے سہارے کے لیے اس سے لپٹ گیا اور اس کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اجنبی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا ”چپ رہو۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

شاداں کو یوں لگ رہا تھا... جیسے کمرے میں اسے لپیٹ لیا ہے۔ وہ بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ سردی کا موسم گزر گیا تھا۔ گرمی آگئی تھی۔ آسمان پر سفید بادل تھے۔ بارش کے بعد تارے چمکنے لگے تھے دھیمی دھیمی روشنی میں اجنبی جوان کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر شاداں نے کہا ”چھوڑو مجھے۔ کون ہو تم؟“

وہ جیسے سحرزدہ سا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

بھارتی جاسوس اور فوجی انہیں تلاش کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ گھروں میں گھس کر جوان لڑکیوں کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسا دوبار ہو چکا تھا کہ ایک فوجی افسر نے جس لڑکی کو بھی چھیڑا تھا۔ وہ دو چار دنوں بعد اس گاؤں سے لاپتا ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک کی لاش پائی گئی تھی۔ دوسری کا پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گم ہو گئی ہے۔

اس سلسلے میں بستی والوں کی مختلف رائے تھی۔ کوئی کہتا تھا۔ فوجی انہیں اٹھالے گئے ہیں اور کوئی کہتا تھا۔ کوئی رشتہ نہیں آتا تھا۔ وہ کیا کرتیں۔ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہیں۔

خصوصی پینکٹ: جاسوسی نشے ایڈمنٹر

شاداں بھی گھر سے بھاگنے والی تھی۔ جبار جان نے اس سے محبت کی قسمیں کھائی تھیں۔ وعدہ کیا تھا کہ اسے سری نگر لے جا کر شادی کرے گا۔ بہت بڑے مکان میں رکھے گا۔ وہ شاداں کے ماں باپ سے اس کا رشتہ مانگ سکتا تھا لیکن اس بستی میں وہ بدنام تھا۔ مسلمان اس سے نفرت کرتے تھے۔ ایک بار اس کی مخبری کے باعث پڑوس کے ایک مکان میں چھاپا مارا گیا تھا۔ وہاں پناہ لینے والا مجاہد فرار ہو چکا تھا لیکن پناہ دینے والوں پر قہر نازل ہوا تھا۔ فوجی ان کے جوان بیٹے کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اسے ٹارچر سیل میں لے جا کر ایسی اذیتیں دی تھیں کہ وہ جوان بیٹا ہاتھ پاؤں سے اپاچ ہو گیا تھا۔

اس بستی کے مسلمان جبار جان سے نفرت بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ وہ ان کے بارے میں فوجیوں تک جھوٹی خبریں بھی پہنچا سکتا تھا اور انہیں مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔ وہ کبھی کبھی دروازے پر آجاتا تو جبراً اس سے مسکرا کر ملنا پڑتا تھا۔

خصوصی پینکٹ: جاسوسی نشے ایڈمنٹر

اس نے شاداں سے کہا تھا ”تیرے ماں باپ کبھی مجھے داماد نہیں بنائیں گے۔ مجھ سے محبت ہے، مجھ پر بھروسہ ہے تو میرے ساتھ چل۔ میں شادی کر کے تجھے عزت و آبرو سے رکھوں گا۔ بعد میں تیرے ماں باپ بھی مان جائیں گے۔ وہاں بڑوں بڑوں تک میری پہنچ ہے۔ تیرے بھائی کو کہیں نوکری پر لگا دوں گا۔ شہر میں تو بھی رہے گی۔ تیرا بھائی بھی کام کرے گا تو ماں باپ بھی یہاں آکر شہری زندگی گزاریں گے۔“

وہ ایسے ہی خواب دیکھتی تھی۔ کوئی آئے اور اسے دلہن بنا کر شہر لے جائے۔ اب جبار جان اس کے یہ خواب پورے کر رہا تھا۔ اس سے یہ طے پایا تھا کہ وہ آدھی رات کے بعد گھر سے نکلے گی اور بستی کے باہر اسے ملے گی۔ جبار جان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام ہی سے بستی کے باہر ایک ہندو

اس کی بات پر چونک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر سرگوشی میں پوچھا ”کیا تم مسلمان ہو؟“
 ”ہاں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔
 ”کیا اس بستی میں پناہ ملے گی؟ تم کہاں رہتی ہو؟ مجھے اپنے گھر لے چلو۔“

وہ جس گھر کو چھوڑ آئی تھی، وہاں اسے کیسے لے جاسکتی تھی۔ وہ زمین سے اٹھ کر شمال کو اچھی طرح پیٹتے ہوئے بولی ”میں... میں یہاں نہیں رہتی ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔“
 وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ یہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کنٹرول لائن پار کر کے آنے والا کوئی مجاہد ہے۔ اس نے اپنے بیگ میں اسلحہ چھپا کر رکھا ہوگا۔ اس بستی میں پناہ لینے آیا ہوگا۔ وہ مجبور تھی۔ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ خود کسی کی پناہ میں جا رہی تھی۔

بننے کے مکان کے پچھواڑے جبار جان ایک سائبان کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں پکارا ”شاداں میں یہاں ہوں۔“

وہ دوڑتے ہوئے آکر اس سے پلٹ گئی۔ اس نے کہا ”تم نے بڑی دیر کر دی۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔ یہاں سے جلدی نکل چلو۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولی ”بابا بیمار ہے۔ بہت کھانسنے رہا تھا۔ جب اس کے خراٹے سنائی دیے ہیں۔ تب آئی ہوں۔“

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے بستی سے دور ہوتے گئے۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ٹھک گئے۔ جبار جان نے پلٹ کر دیکھا پھر کہا ”تمہاری بستی میں فائرنگ ہوئی ہے۔“

وہ بڑے دکھ سے بولی ”بیچارہ۔“
 جبار جان نے حیرانی سے پوچھا ”کسے بیچارہ کہہ رہی ہو؟“

”ابھی راستے میں ایک مسلمان اجنبی مجھ سے ٹکرایا تھا۔ وہاں پناہ لینے گیا تھا۔“
 ”پھر تو گیا ہی کیا سمجھو۔ پتا نہیں یہ لوگ کیوں مرنے چلے آتے ہیں۔“

وہ پھر ایک طرف آگے بڑھنے لگے۔ شاداں نے کہا۔ ”ایسی حقارت سے نہ بولو۔ وہ سر سے کفن باندھ کر ہماری آزادی کے لیے آتے ہیں۔ یا خدا مجھے ایسا لگ رہا ہے... جیسے میں نے اسے بے موت مارا ہے۔“

”اس کے لیے ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟“

ایک صاحب نے فخریہ انداز میں اپنی فٹری ساتھی سے کہا ”آج تک کوئی لڑکی مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔“

”تو پھر اس کے باوجود آپ اتنے بے وقوف کیوں نظر آتے ہیں؟“ لڑکی نے معصومیت سے پوچھا۔

محمد ہجاد بھٹہ 03045503086

پوچھا۔

”وہ مجھ سے پناہ مانگ رہا تھا۔ میں اسے گھر لے جاسکتی تھی مگر نہیں لے گئی۔ اسے کیسے بتاتی کہ گھرت بھاگ کر آئی ہوں۔“

وہ چلتے چلتے اسے خیالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ جکڑ رکھا تھا۔ اس کا موسم بدل رہا تھا۔ جیسے تقدیر بدل رہا ہو۔

جبار جان نے کہا ”اسے گھر لے جاتیں تو کیا ہوتا؟ فائرنگ کی آواز سنی ہے نا؟ ایک گولی تمہیں بھی لگتی۔ مجھے دعائیں دو۔ میرے عشق نے تمہیں بچالیا ہے۔“

وہ باتیں کرتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ریسٹ ہاؤس میں آگئے۔ وہ بولا ”ہم یہاں ذرا دم لیں گے۔ میں تمہیں گرم گرم قوہ پلاؤں گا۔“

اس نے پوچھا ”یہ اتنا بڑا مکان کس کا ہے؟“
 وہ ہنستے ہوئے بولا ”یہ مکان نہیں ہے۔ ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں بڑے بڑے افسر آکر رہتے ہیں۔“

وہ سہم کر بولی ”وہ لوگ ہمیں دیکھتے ہی پکڑ لیں گے۔“
 ”وہ ہمیں کیوں پکڑیں گے؟“
 ”انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں گھرت بھاگ کر آئی ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا ”تم گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔ ان کے باپ کا کیا جائے گا پھر میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ کہہ دوں گا کہ تم میری گھر والی ہو۔ تمہیں سری نگر لے جا رہا ہوں۔“

وہ ریسٹ ہاؤس کے سامنے پہنچتے ہوئے بولی ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“
 ”یہاں کے سب لوگوں سے میری جان پہچان ہے۔ میرے ساتھ رہ کر ڈرو گی تو زندگی کیسے گزارو گی۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے برآمدے میں آئی۔ چونکدار نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔ اس نے کہا ”دروازہ کھولو۔ ہم تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جائیں گے۔“

گے۔“

کہ مخبری کرنے والا دلال یہ بھی کر سکتا ہے۔

وہ افسر اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر جبار جان کو دے رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر وہاں سے بھاگنے لگی۔ جبار جان نے بخشش لے کر پھر ہاتھ جوڑے اور کہا ”میں یہاں رہوں گا۔ آپ موج کریں۔ بعد میں اسے ٹھکانے لگانا ہوگا۔ دوسری لڑکیوں کی طرح یہ بھی واپس نہیں جائے گی۔“

چوکیدار نے دروازے پر آکر کہا ”جبار بابو! وہ جو آپ کے ساتھ آئی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے کہیں جا رہی ہے۔“ وہ دونوں چونک گئے۔ جبار جان نے غصے سے کہا ”وہ کہاں جا رہی ہے۔ اسے پکڑو۔ تم نے اسے جانے کیوں دیا؟“

وہ جواب سنے بغیر تیزی سے دوڑتا ہوا جانے لگا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے رسی کی لمبائی تک بھاگتی ہے۔ آخر کھونٹے کی طرف واپس آجاتی ہے۔ وہ ضرور اپنے گھر کی طرف جا رہی ہوگی۔ وہ بھی اسی طرف دوڑتے ہوئے جانے لگا۔

ابھی چاند نہیں نکلا تھا۔ چاندنی ہوتی تو وہ ذرا دور سے نظر آجاتی۔ وہ دور تک دوڑتا ہوا آیا پھر پکارنے لگا ”شاداں۔ شاداں تم کہاں ہو؟“

دور سے اس کی آواز سنائی دی ”خبردار میرے پاس نہ آنا۔ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ میرے پاس آؤ گے تو میں منہ پر تھوک دوں گی۔“

”ایسی بات کیوں کہہ رہی ہو؟ اچانک مجھ سے نفرت کیوں کر رہی ہو؟ رک جاؤ۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کر دوں گا۔“

محمد سجاد بھٹہ 03045503086

اس کا جواب سنائی نہیں دیا۔ وہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ وہ بستی میں واپس جائے گی تو اسے تمام مسلمانوں کی نظروں میں اور قابل نفرت بنا دے گی۔

وہ تاریکی میں ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ سخت چوٹیں آئیں۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے اٹھنے لگی۔ لنگڑاتے ہوئے چلنے لگی۔ ایک گھٹنے میں چوٹ لگی تھی۔ دوڑنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا قریب آگیا۔ وہ پیچھے ہٹ کر ایک پتھر سے لگ کر چیختے ہوئے بولی ”میرے قریب نہ آنا۔ تم جھوٹے ہو۔ مکار ہو۔ فوجیوں کے دلال ہو۔ میں تم پر تھوکتی ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا ”آخری بار تھو کو گی۔ کوئی دیکھنے نہیں آئے گا۔ میرے ساتھ چلو۔ تمہیں عیش کراؤں گا۔ ہمارے میجر صاحب بڑے دیا لو ہیں۔ مجھے اور زیادہ انعام دیں گے۔“

”لعنت ہے تم پر۔ بٹے کٹے ہو کر محنت مزدوری نہیں کرتے۔ دلالی کرتے ہو۔ کیا اپنی بہن کو بھی فوجیوں کے پاس لے جاتے ہو؟“

چوکیدار دروازہ کھول کر چلا گیا۔ وہ کمرے میں آکر بولا ”دیکھا تم نے؟ یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں گرما گرم قہوہ لے کر آتا ہوں۔“

”کہاں سے لاؤ گے؟“

”رہسٹ ہاؤس کے پیچھے بڑا سا باورچی خانہ ہے۔ میں ملازم سے کہوں گا۔ وہ قہوے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لے آئے گا۔“ وہ باہر جاتے ہوئے بولا ”دروازہ بند نہ کرنا۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔“

وہ جانے لگا۔ شاداں دروازے کے باہر آکر کھڑی ہو گئی۔ تنہا کمرے میں ڈر لگ رہا تھا۔ جبار جان وہاں سے چلتا ہوا برآمدے کے آخری کمرے میں جا رہا تھا۔ وہ بھی ادھر جانے لگی۔ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اکیلی نہیں رہے گی۔ اس کے ساتھ باورچی خانے میں جائے گی۔

وہ اس آخری کمرے کے پاس آئی پھر کھڑکی کے پاس پہنچ کر ٹھنک گئی۔ کمرے کے اندر وہ فوجی افسر دکھائی دیا جو ایک ہفتے پہلے ان کی بستی میں آیا تھا۔ ان کے گھر کی تلاشی لی تھی۔ اس روز باب اور بھائی گھر میں نہیں تھے۔ ماں نے افسر سے کہا ”آپ کو کسی نے جھوٹی خبر دی ہے۔ ہم کبھی کسی اجنبی کو پناہ نہیں دیتے ہیں۔“

وہ افسر شاداں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس کی ماں سے بولا۔ ”ہمارے جاسوس جھوٹی خبر نہیں پہنچاتے ہیں۔ جب وہ پاکستانی پکڑا جائے گا تو میں تیری چھو کری کو بھی پکڑ کر لے جاؤں گا۔ تیرے سامنے اس کا وہ حال کروں گا کہ تو دیکھ نہیں سکے گی اندھی ہو جائے گی۔“

اس نے ایسا کہتے کہتے شاداں کو سینے سے لگا کر دبوچ لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو چھڑا کر ماں کے پیچھے آگئی تھی۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔

اب وہی افسر رہسٹ ہاؤس کے اس کمرے میں نظر آ رہا تھا۔ جبار جان دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا ”میں تو آپ کا غلام ہوں۔ بڑی مشکل سے اسے پٹا کر لایا ہوں۔“

افسر نے کہا ”چھو کری زبردست ہے۔ ایک بار اسے سینے سے لگانے کے بعد میری نیند اڑ گئی تھی۔ سالی بھیجے کے اندر گھس گئی ہے۔ آج میں۔۔۔“

اس نے آگے ایسی شرمناک بات کہی جسے سن کر وہ لرز گئی۔ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہاتھ جوڑنے والے غلام کو دیکھنے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات و احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہم دونوں کی پیش گوئیاں کرنے والے درست ہیں۔ شاید ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں یہاں مرنے والے ہیں۔

جبار جان نے اچانک ہی چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا پھر اسے رگیدتے ہوئے پیچھے پتھر سے ٹکرا دیا۔ اس کے منہ پر گھونسا مارنا چاہتا تھا لیکن اجنبی ہٹ گیا۔ گھونسا پتھر پر لگا۔ جبار جان کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کے منہ پر گھونسا پڑا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔

شاداں سینے پر ہاتھ رکھے ایک طرف کھڑی دونوں کو گھم گتھا ہوتے دیکھ رہی تھی۔ کبھی جبار جان اس پر بھاری پڑ رہا تھا۔ کبھی اجنبی اس پر غالب آ رہا تھا۔ شاداں نے ایک طرف بڑے ہوئے بیگ کو دیکھا۔ خیال آیا، اجنبی نے اس میں اسلحہ چھپا کر رکھا ہوگا۔ اسے بیگ تک پہنچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ جبار جان کے پاس بھی اسلحہ نہیں تھا۔ دونوں خالی ہاتھ لڑ رہے تھے۔

وہ دوڑتے ہوئے بیگ کے پاس آئی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ اندر دوسرے سامان کے ساتھ ایک شاٹ گن اور بلبٹس رکھے ہوئے تھے۔ وہ شاٹ گن نکال کر چیختے ہوئے بولی ”اجنبی ہٹ جاؤ! میں اسے گولی مار دوں گی۔ یہ کتا میرے ہاتھوں مرے گا۔“

اس نے شاٹ گن کو دیکھتے ہی اجنبی کو اس کی طرف دھکا دیا پھر وہاں سے بھاگنے لگا۔ شاداں نے فائر کیا۔ وہ اناڑی تھی۔ چیخ نشانہ نہیں لگا سکتی تھی۔ اس کا دوسرا فائر بھی خالی گیا۔ اجنبی نے اس سے گن لے کر گولی چلائی۔ اس وقت تک وہ ایک موڑ پر پہاڑی ٹیلے کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔ وہ بولا ”دور نکل گیا ہے۔ نہ نشانے پر آئے گا نہ پکڑا جائے گا۔“

وہ بولی ”تم نہ آتے تو وہ مجھے مار ڈالتا۔ میں شرمندہ ہوں۔ میں تمہیں پناہ دینے کے لیے اپنے گھر لے جاسکتی تھی مگر وہ شیطان مجھے بھکا کر ادھرا رہا تھا۔“

”وہ بھاگ گیا ہے۔ تم تنہا کیسے جاؤ گی۔ میں ابھی تمہاری بستی کی طرف سے آ رہا ہوں۔ وہ تو بہت دور ہے۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا ”تم ہی بہن بن جاؤ اور دیکھو کہ بہن اور بیٹی کی بھی دلالی ہوا کرتی ہے۔“

وہ اسے کھینچ کر لے جانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ اس نے کہا ”زندہ رہنا چاہتی ہو تو سیدھی طرح چلو۔ ورنہ ادھر کھائی ہے۔ نیچے پھینک دوں گا۔“

وہ بڑی مشکل سے ہاتھ چھڑا کر بولی ”پھینک دو۔ مار ڈالو مجھے۔ میں نے ماں باپ کی بدنامی کا خیال نہیں کیا۔ غیرت مند بھائی کا سر جھکا دیا۔ مجھے مرجانا چاہیے لیکن میں پہلے گھر جا کر معافی مانگوں گی انہیں یقین دلاؤں گی کہ عزت سے واپس آئی ہوں۔ وہ معاف نہیں کریں گے تو میں پھندا لگا کر مر جاؤں گی۔“

وہ پلٹ کر بستی کی طرف بھاگنے لگی۔ جبار جان اس کے پیچھے دوڑا، دوڑتے ہی اچھل کر اوندھے منہ گرا۔ اس کی چیخ سن کر شاداں رک گئی۔ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جبار جان بھی اٹھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ایک چٹان کے پیچھے وہ کھڑا ہوا تھا۔ اسی نے ٹانگ اڑا کر اسے گرایا تھا۔

پچھلے پسر کا چاند نکل آیا تھا۔ چاندنی پھیل رہی تھی۔ وہی اجنبی نظر آ رہا تھا جس نے اسے پکڑا تھا جکڑ لیا تھا۔ پہلے موسم بدل کر گیا تھا۔ اب مقدر بدلنے آیا تھا۔ جبار جان نے غرا کر پوچھا ”کون ہے بے تو؟“

اجنبی نے پوچھا ”کیا اپنے باپ سے بھی ایسے ہی بولتے ہو؟“

پھر اس نے شاداں سے کہا ”اور تم۔ تم تو اس بستی میں تمہیں۔ اتنی رات کو اکیلی کہاں جا رہی ہو؟ یہ بد معاش کون ہے؟“

”میں اس کا آدمی ہوں۔ یہ میری گھر والی ہے۔“ شاداں نے تھوکتے ہوئے کہا ”تھو۔ یہ دلال ہے۔ کمینہ ہے۔ کتا ہے۔ یہ شادی کرنے کے بہانے مجھے ایک فوجی افسر کے پاس لے جا رہا تھا۔“

اجنبی نے کہا ”میں سن رہا تھا۔ یہ سچ مچ کتا ہے۔ کتے کی موت مرے گا۔“

جبار جان نے کہا ”مجھے موت کی دھمکی نہ دو۔ ایک بہت بڑے جیوتشی نے کہا ہے کہ میری زندگی ختم ہونے والی ہے۔ میں جلد ہی مرنے والا ہوں۔ جب مرنا ہی ہے تو ڈرنا کیا۔ میں تو مرتے مرتے بھی تمہیں لے مروں گا۔“

اجنبی نے کہا ”عجیب اتفاق ہے۔ ایک بہت بڑے ڈاکٹر کی میڈیکل رپورٹ نے کہا ہے کہ میری عمر بھی کم رہ گئی ہے۔ میں سال چھ مہینے سے زیادہ نہیں جیوں گا۔ معلوم ہوتا ہے۔“

میں تمہیں پہنچانے کے لیے وہاں تک نہیں جاسکوں گا۔
 ”ہاں یاد آیا۔ میں نے بستی میں فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ مجھے یہی خیال آیا کہ فوجیوں نے تمہیں گولی ماری ہے۔
 خدا کا شکر ہے تم زندہ سلامت ہو۔“

”انہوں نے اندھیرے میں گولی چلائی تھی۔ میں بچ کر ادھر چلا آیا ہوں۔ اندھیرے میں راستہ بھٹک گیا تھا۔ اب چاندنی میں سفر کر سکوں گا۔“
 ”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”میں سوپور جاؤں گا پھر وہاں سے بھی آگے جانا ہے۔“
 وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔
 ”میں دوبار سوپور جا چکی ہوں۔ تمہیں وہاں تک پہنچا سکتی ہوں۔“

”تم اپنے گھر نہیں جاؤ گی؟ کیا تمہیں اپنے گھر سے باہر بھٹکنا اچھا لگتا ہے؟“
 ”پہلے بھٹک گئی تھی۔ تم سے امید ہے مجھے بھٹکنے نہیں دو گے۔ میں اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔“
 محمد مجاہد بھٹہ 03045503086

”پھر کہاں جاؤ گی؟“
 ”میں گھر سے بھاگ کر آئی ہوں۔ واپس جاؤں گی تو بستی والے دیکھیں گے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ کیا تم میری شرم رکھو گے؟“
 وہ حیرانی سے بولا ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

وہ تو پہلی ملاقات میں ہی سحر زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک اسے خیالی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا۔ مجبور تھا۔ اس کے پیچھے نہیں جاسکتا تھا۔ بستی میں پناہ لے کر دوسرے دن آزاد کشمیر کی طرف جانا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے مگر تقدیر انہیں بھٹکا کر پھر رو رو کر لے آئی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی ”ہو سکتا ہے۔ وہ شیطان کہیں چھپا ہو۔ تم چھوڑ کر جاؤ گے تو وہ پھر آکر مجھے پکڑ لے گا۔ کیا تم ایسا چاہو گے؟“

”میں تمہاری بستی کی طرف تمہیں نہیں لے جاسکتا۔ دشمن تلاش کر رہے ہوں گے۔ تمہیں اپنے ساتھ کہاں لے جاؤں؟ میں تو خود بھٹک رہا ہوں۔ پتا نہیں کنٹرول لائن پار کر سکوں گا یا نہیں۔“

”ہم دونوں اس پار جائیں گے۔ زندگی رہی تو جنیں گے ورنہ ادھر گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ میں تمہارے ساتھ جینا مرنا چاہتی ہوں۔“

”اچانک اتنا بڑا فیصلہ نہ کرو۔ اگر سوپور میں تمہارا کوئی ہے تو میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔“

”میرا کوئی نہیں ہے۔ کیا میں اچھی نہیں ہوں؟ مجھ میں کوئی عیب ہے؟ یا گھر سے بھاگ کر تمہاری نظروں سے گر گئی ہوں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے گولی مار کر جاؤ۔ میں نظروں سے گر کر زندہ نہیں رہوں گی۔ یہ تمہارے لیے آسان ہو گا۔ میں مصیبت بن کر تمہارے پیچھے پیچھے نہیں آؤں گی۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں کسی محفوظ مقام تک پہنچا سکتا ہوں۔ میرے ساتھ زندگی گزارنے کی باتیں نہ کرو۔ تم نہیں جانتیں۔ میری زندگی بہت تھوڑی سی رہ گئی ہے۔“
 ”تم ابھی کہہ رہے تھے کہ بہت بڑے ڈاکٹر نے تمہاری موت کی پیش گوئی کی ہے۔ کیا کسی کے کہنے سے آدمی مرجاتا ہے؟ تم زندگی سے مایوس کیوں ہوتے ہو؟“

”یہ کسی انسان کی پیش گوئی نہیں ہے۔ میڈیکل رپورٹ ہے۔ میں کینسر کا مریض ہوں شاید ایک برس جی سکوں گا۔ اس سے پہلے کسی مہینے کسی دن بھی مر سکتا ہوں۔“
 ”تم نہیں مرد گے۔ میرے مقدر سے جیو گے۔ میں تمہیں اپنی عمر دے دوں گی۔“

”تم مجبتیں دے سکتی ہو۔ مجھ پر قربان ہو سکتی ہو لیکن اپنی عمر نہیں دے سکتیں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ یہاں خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھے جانا چاہیے۔ تم اپنے بارے میں دانش مندی سے فیصلہ کرو۔“
 وہ اس کا بیگ اٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے بولی ”فیصلہ کر چکی ہوں۔ آگے بڑھتے رہو اور جو بولنا ہے۔ بولتے رہو۔ میں تو گھر سے نکل چکی ہوں۔ کہیں تو جانا ہی ہے۔ اس لیے جا رہی ہوں تمہیں بوجھ لگوں گی تو کسی کھائی میں دھکا دے دینا۔“

نصوحہ پیشکش: بابو جی نشیٹہ ایڈمز
 وہ پریشان ہو رہا تھا اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا ”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تم مصیبت نہیں ہو۔ بہت اچھی ہو۔ میں... میں پہلی بار تمہیں دیکھ کر تمہاری آرزو کرنے لگا تھا۔ اس تھوڑی سی زندگی میں کوئی میری آخری خواہش پوچھے تو میں تمہیں مانگوں گا لیکن تمہاری زندگی تباہ نہیں کروں گا۔ تمہیں چند دنوں یا چند مہینوں کی سہاگن نہیں بناؤں گا۔“

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ بیگ کو زمین پر چھوڑ کر اس کے قریب آئی پھر اس کی گردن میں بائیں ڈال کر بولی ”میں اس شیطان کے جال میں پھنس جاتی تو نہ جانے بے حیائی کی کتنی لمبی زندگی گزارتی۔ اس لمبی زندگی سے کیا عزت کے چند دن بہتر نہیں ہیں؟ تم سے جو عزت اور محبت مجھے ملے گی، وہ کسی اور سے نہیں مل سکے گی۔“

وہ سانسوں کے قریب آگئی تھی پھر موسم بدل گیا تھا۔ دونوں طرف سے گرم ہوا نہیں چلنے لگیں۔ کشمیر کی کلی مہک

رہی تھی۔ ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر دھڑکنیں منتقل ہو رہی تھیں۔ ایسے سنگین لمحات میں کچھ سوچا نہیں جاتا۔ کچھ سمجھا نہیں جاتا۔ فیصلے خود بہ خود ہو جاتے ہیں۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔ فاصلے کم ہو گئے تھے۔

○☆☆○

جبار جان اپنی جان بچا کر آگیا تھا۔ اسے اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ شاداں اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس بات کی پریشانی تھی کہ موت قریب آکر گزر گئی تھی۔ گرد دیال سنگھ کی پیش گوئی کے مطابق وہ مرنے والا تھا۔ موت نے خود ہی راستہ بدل لیا تھا۔

گرو نے یہ نہیں بتایا تھا کہ موت کیسے آئے گی؟ طبعی موت مرے گا یا مارا جائے گا۔ اسے مارا جانا پسند نہیں تھا۔ طبعی موت آئے تو مرنا ہی پڑتا ہے لیکن حرام موت کوئی نہیں چاہتا۔ وہ دوسری صبح گرد دیال سنگھ کی چوکھٹ پر گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ گرو نے کہا۔ ”بہت پریشان ہو۔ میں نے پہلے کہا تھا۔ مجھ سے زیادہ باتیں نہ پوچھا کرو۔ تم ضد کرتے رہے۔ مجھے بتانا پڑا۔ اب بتانے کو کیا رہ گیا ہے؟ کیا پوچھنے آئے ہو؟“

وہ اس کے پیروں کو چھو کر بولا ”آپ مہا گیانی ہیں۔ آپ کی کوئی بات کبھی جھوٹی نہیں ہوتی۔ بس ایک بات اور بتا دیں۔ میری موت کیسے ہوگی؟“

”یہ تو ایسا شور ہی جانتا ہے۔ نہ میں جان سکتا ہوں۔ نہ بتا سکتا ہوں۔“

”آپ جانتے ہیں۔ بتانا نہیں چاہتے۔“

”جو نہ بتانے کی بات ہے۔ وہ میں نے بتا دی۔ میجر صاحب کی سفارش لے کر آئے تھے۔ میں نے ان کی بات رکھ لی۔“

”جب آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میری زندگی بہت کم رہ گئی ہے۔ تو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ مجھے کوئی برا روگ لگے گا۔ میں بیمار رہ کر مروں گا؟ یا چلتے پھرتے مروں گا؟ یا کوئی مجھے مار ڈالے گا؟“

”تم مورکھ ہو۔ موت تو کسی بھی بہانے سے آتی ہے۔“

اس کی چٹا کیوں کرتے ہو۔“

”پہلے مجھے فکر نہیں تھی۔ کل رات ایک دشمن نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک نہیں دو گولیاں چلائی تھیں مگر میں زندہ سلامت آپ کے سامنے ہوں۔“

”جھگوان کا شکر کرو۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں کوئی نہیں مارے گا۔ موت کسی دوسری طرح آئے گی۔ میں اسی طرح اندازے سے کہہ سکتا ہوں۔ کوئی

پکی بات نہیں بتا سکتا۔“

”آپ کے منہ سے اگلا ہوا ایک ایک لفظ درست ہوتا ہے۔ آپ نے کہا۔ مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ موت کا ڈر نہیں ہے۔ وہ تو سب کو آتی ہے۔ شکر ہے۔ میں حرام موت نہیں مروں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر آگیا۔ گرد دیال سنگھ مانا ہوا جیوتی تھا۔ جنم کنڈی اور ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر ماضی، حال اور مستقبل کی جی باتیں بتاتا تھا۔ راج دھانی کے پردھان منتری اسے اکثر بلایا کرتے تھے۔ اس کی ایک ایک پیش گوئی پر اعتماد کرتے تھے۔ اسے راج دھانی میں کوٹھی، کار اور منہ مانگا معاوضہ دینا چاہتے تھے لیکن وہ اپنے باپ دادا کی طرح سری نگر میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ پردھان منتری کے پاس جانے اور آنے کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجا جاتا تھا۔

اس کی پیش گوئیاں بہت مشہور تھیں۔ جو اسے جانتے تھے اور مانتے تھے، وہ اس کے قصے سناتے رہتے تھے اور وہ قصے من گھڑت نہیں ہوتے تھے۔ وہ جو بات کہتا تھا۔ وہ پتھر کی لکیر بن جاتی تھیں۔ جبار جان کو یہ آخری بات سن کر اطمینان ہوا تھا کہ وہ کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جائے گا۔

وہ ایک سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ ایک مارکیٹ سے گزر رہا تھا۔ ایک فوجی جیب اس کے قریب آکر رک گئی۔ اس نے ایک فوجی افسر کو دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

روحانی علاج اور روایتی طبیعت کا مرکز

الفرازی آسٹرو ہومیو پتھوسوسائزر

زیر نگرانی: سید انور قرازی

ہر قسم کے جسمانی، نفسیاتی اور روحانی علاج کے لئے مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ فون نمبر 5897126

اوقات ملاقات: شام 5 بجے تا رات 10 بجے

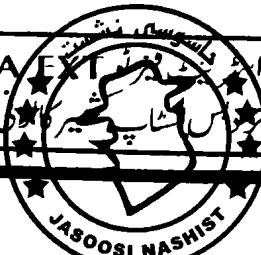
(گولڈ میڈلسٹ)

ڈاکٹر امبر امروزی

D.H.A EXT 73-C ایون 73-C

مین کورنگی روڈ، شاہ پور، کراچی

پتہ



افسر نے کہا ”اے کہاں مر گیا تھا؟ کیمپ میں کیوں نہیں آیا؟
مہر جگجیت دریا تجھے پوچھ رہے ہیں۔ چل پیچھے بیٹھ جا۔“
پیچھے دو مسلح جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے پاس آکر
بیٹھ گیا۔ بیٹھے ہی اس کے منہ پر کوئی چیز آکر لگی۔ مرغی کا ایک
انڈا اس کی پیشانی سے ٹکرا کر ٹوٹا تھا۔ اس کی زردی اور
سفیدی پیشانی سے نیچے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ وہ قمیص کے
دامن سے منہ پونچھنے لگا۔

فوجی افسر نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر غصے میں کہا ”یہ
کسی مسلمان کی بد معاشی ہے دیکھو کون ہے؟ میرے سامنے
کس نے یہ ہمت کی ہے۔“

مسلح جوان جیب سے اتر کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔
مارکیٹ میں لوگوں کی بھیر تھی۔ وہ اس پاس کے دکان داروں
اور راہ گیروں سے پوچھنے لگے۔ سب لا علمی ظاہر کرنے لگے۔
کسی نے انڈا مارنے والے کو نہیں دیکھا تھا۔ جبار جان نے
افسر سے کہا ”چلو صاحب ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ لوگوں
کی سیوا کرتا ہوں۔ یہ کچھ مسلمانوں کو اچھا نہیں لگتا۔“

جیب وہاں سے چل پڑی۔ اس نے کیمپ میں آکر میجر
کے سامنے پہنچ کر دونوں ہاتھ جوڑے۔ میجر نے کہا ”کیا تجھے
جبلی چڑھ گئی ہے؟ کل تو نے حاضری نہیں دی۔“

”حضور جموں کے ایک میجر صاحب منگور بستی کی طرف
آئے تھے۔ ان کی نوکری کر رہا تھا۔“
”میں تمہیں اسی گاؤں کی طرف بھیجنا چاہتا تھا۔ ایک
پاکستانی جاسوس ادھر کے علاقوں میں ہے۔ کنٹرول لائن پار
کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے اسے گرفتار کرنا ہوگا۔ تم کتنی
ہی بستیوں کے گھروں میں دعا سلام کے بہانے گھسے رہتے ہو۔
اس نے کسی مسلمان کے گھر میں پناہ لی ہوگی۔ اسے آج ہی
کسی طرح ڈھونڈ نکالنا ہے۔“

”مجھے گاڑی مل جائے تو ابھی چلا جاؤں گا۔ اس جاسوس
کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے۔“

میجر نے ایک فائل کھولتے ہوئے کہا ”یہ ایک ماہ پہلے
کپواڑہ کی طرف دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد کہیں روپوش
ہو گیا تھا۔ اس نے کارگل کی طرف جانے والے راستے اور
فوجی چوکیوں کی تصویریں اتاری ہیں۔ ایک جاسوس نے اسے
پکڑ لیا تھا لیکن وہ اسے زخمی کر کے فرار ہو گیا۔ کل پتا چلا کہ وہ
منگور کی طرف کہیں چھپا ہوا ہے۔ وہاں اسے تلاش کیا جا رہا
ہے۔ ہمارے زخمی جاسوس نے اس کی یہ تصویر اتاری تھی۔
یہ دیکھو۔“

میجر نے اس فائل کو کھول کر اسے دکھایا۔ اس فائل
کے ایک کانڈ پر ایک تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ تصویر کو دیکھتے ہی

چونک کر بولا ”یہ۔۔۔ یہ حضور یہ تو وہی ہے۔ اس نے کل
رات مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں اکیلا تھا۔ اسے قابو میں نہ
کر سکا۔ اس کے پاس ایک شاٹ گن تھی۔“

”ہاں یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے پاس ایک شاٹ گن
تھی۔ تمہیں فوراً کسی قریبی کیمپ سے مدد حاصل کرنا چاہیے
تھی۔“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ پاکستانی جاسوس ہے۔ مجھے ذرا
بھی شبہ ہوتا کہ وہ مسلمان ہے اور اس پار سے آیا ہے تو میں
کیمپ سے ضرور مدد لینے کے لیے جاتا۔“

میجر نے غصے سے کہا ”شاٹ! وہ کئی بار ہاتھ آکر نکل گیا
ہے۔ ابھی گاڑی اور سپاہیوں کو لے کر جاؤ۔۔۔ اسے ان
علاقوں میں گھیرا جاسکتا ہے۔“

”حضور میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ ادھر کے مسلمان
میرے دشمن ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے ایک بندوق دے دو۔
کل میرے پاس بندوق ہوتی تو میں اسے جانے نہ دیتا۔“

اس نے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر ایک رائفل اور
کارٹوس لائے کا حکم دیا۔ وہ حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا پھر
اس نے پوچھا ”یہ پچھلی رات تم سے کہاں ٹکرایا تھا؟“

”میں منگور بستی سے پانچ میل دور رسٹ ہاؤس کی
طرف جا رہا تھا۔ وہیں اس نے مجھ پر اچانک حملہ کیا تھا۔
جلدی میں کہیں بھاگا جا رہا تھا۔ مجھ سے فوراً ہی چھٹکارا پانے
کے لیے اس نے شاٹ گن سے فائرنگ کی۔ میں پتھروں کی
آڑ میں بچتا ہوا اس سے دور چلا آیا۔ اس وقت اندھیرا تھا۔
اس لیے وہ صحیح نشانہ لگا نہیں پایا اور میں بچ گیا۔ اب آپ
رائفل دے رہے ہیں۔ یہ آپ کی مہربانی ہے۔ اب سامنا
ہوگا تو اسے زندہ نہیں جانے دوں گا۔“

”بہت مجبوری ہو۔ تب اسے گولی مارنا۔ ورنہ زخمی
کر کے گرفتار کرنا۔ ہمیں اس سے بہت کچھ اگلوانا ہے۔“
”آپ جو حکم دیں گے، وہی کروں گا۔ اسے زندہ گرفتار
کر کے لاؤں گا۔“

میجر زیر لب بڑبڑانے لگا۔ وہ کپواڑہ کی طرف دیکھا گیا
تھا۔ اس کے دوسرے دن ان آتنگ وادیوں نے اس پل کو
ریموٹ کنٹرول بم سے اڑا دیا۔ جو کپواڑہ اور لولاک کے
درمیان ہے۔ اس وقت پل پر سے ہماری دو فوجی گاڑیاں گزر
رہی تھیں۔ وہ گاڑیاں تباہ ہو گئیں۔ اس میں بیٹھے ہوئے فوجی
مارے گئے۔ بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔

”حضور ادھر کنٹرول لائن کی طرف مسلمانوں کی آبادی
زیادہ ہے۔ وہاں آتنگ وادی (دہشت گرد) ان مسلمانوں
کے درمیان ایسے چھپ جاتے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔“

حسد

”سنا ہے تمہارے پاس نے تمہیں نوکری سے نکال دیا؟“

”ہاں‘ تم نے ٹھیک سنا ہے۔“
”وجہ کیا ہوئی؟“

”پاس مجھ سے حسد میں مبتلا ہو گئے تھے۔
تمہیں تو معلوم ہی ہے پاس اس شخص کو کہتے ہیں جو
کوئی کام نہیں کرتا۔ بس دفتر میں ادھر ادھر پھرتا
رہتا ہے۔“

”ہاں لیکن پاس تم سے حسد میں کیوں مبتلا
ہو گئے تھے؟“

”دفتر میں لوگ مجھے پاس سمجھنے لگے تھے۔“

ہے۔ انسان کے اندر جو جان ہے، وہ ایک پردہ کی طرح
ہے۔ بدن کی سرائے میں کچھ وقت کے لیے ایک پردہ کی
طرح آکر ٹھہرتی ہے پھر رخصت ہو جاتی ہے۔



سدا نہیں باغ بے غنجے
سدا نہ ہوندے فرش غلجے
ہر دم فکر چلن دیکھتے
اوڑک موت لکھیسی آ

سمجھ بندے تو نال فکر دے ایسہ جندڑی پردہ کی آ

جبار بن کی جندڑی بھی پردہ کی تھی۔ ایک جان ایک ہی
بار ملتی ہے اور وہ جان اس کے جسم کے سرائے خانے سے
رخصت ہونے والی تھی لیکن اسے فکر نہیں تھی۔ وہ جان
دینے اور جان لینے کی سوداگری میں مصروف تھا۔ ایسے لوگ
ہوتے ہیں جو موت کے قریب پہنچ کر زندگی کے باغ باغیچے
زیادہ سے زیادہ سمیٹنا چاہتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں ہتھیار
ہوتے ہیں۔ ان کا یہی ایک بنیادی اصول ہوتا ہے کہ آپ
مرنے سے پہلے جتنے سدا مار سکتے ہو، مارتے چلے جاؤ۔

وہ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے منگور کی طرف جا رہی
نھی۔ ایک سپاہی کان پر ہاتھ رکھ کر اونچی تان لگا رہا تھا۔ سُر
میں گارہا تھا۔

اے جندڑی اے میری سہیلی
کوئی نہ ہو گا ساتھی بلی
رہے گی اندر گور اکیلی

مبجرنے کہا ”معلوم ہوتا ہے یہ جاسوس پہلے کسی علاقے
میں جاتا ہے۔ وہاں کے تمام حالات معلوم کرتا ہے پھر ان
آنگ وادیوں کو سنگل دیتا ہے۔ وہ بڑی رازداری سے وہاں
کارروائیاں کر کے فرار ہو جاتے ہیں۔“

ماحت ایک رانفل اور کارتوس کے دو پیکٹ لے آیا۔
جبار جان نے وہ سب کچھ لیتے ہوئے شکر یہ ادا کیا پھر اس دفتر
سے باہر آیا۔ باہر ایک چھوٹا سا فوجی ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ مسلح
سپاہی اس میں بیٹھ رہے تھے۔ ایک جاسوس نے ناگواری سے
بڑبڑاتے ہوئے کہا ”کیا مصیبت ہے۔ کل ساری رات منگور
بستی میں جاگتا رہا۔ آج صبح آیا ہوں پھر وہاں جانا پڑ رہا ہے۔“
جبار جان نے قریب آکر پوچھا ”تم منگور میں تھے۔ اسی
جاسوس کو تلاش کر رہے تھے؟“

”ہاں۔ وہ کل رات اندھیرے سے فائدہ اٹھاتا رہا۔
بستی میں ایک بار نظر آیا تھا۔ ہم نے فائرنگ کی۔ وہ بچ کر نکل
گیا۔ ہم صبح تک اسے تلاش کرتے رہے۔“

”تم اس بستی میں کریم داد کو جانتے ہو۔ اس کا ایک
جوان بیٹا ہے مولا داد اور جوان بیٹی ہے شاداں۔ وہ کم بخت
میرا دشمن ہے۔ مجھے بھارتی فوجیوں کا دلال کہتا ہے۔“

اس جاسوس نے کہا ”وہ کون سا عزت دار ہے۔ کل
رات اس کی جوان بیٹی کہیں بھاگ گئی ہے۔ صبح بستی میں بڑا
چرچا ہو رہا تھا۔ چند مسلمان تیرے خلاف بول رہے تھے۔“

”وہ تو میری برائیاں کرتے ہی رہتے ہیں۔ وہ ابھی تک
گھر واپس نہیں گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ کسی مرد کے
ساتھ بھاگ گئی ہے۔ جوانی میں صحیح وقت پر صحیح خوراک نہ

ملے تو لڑکیاں ایسے ہی پاگل ہو جاتی ہیں۔ یہ جو پاکستان سے
آنگ وادی آتے ہیں، وہ ایسی لڑکیوں کو اپنی خوراک بناتے
ہیں اور وہ سالے بستی والے خواہ مخواہ مجھے بدنام کرتے ہیں۔“

جاسوس نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مار کر کہا ”تو بڑا نیک
نام ہے۔ شیطان کے بیچ سے پیدا ہوا ہے۔ ہم سے زیادہ تجھے
کوئی نہیں جانتا۔ چل بیٹھ جا۔ گاڑی جا رہی ہے۔“

وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں سپاہیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔
جاسوس اگلی سیٹ پر چلا گیا پھر وہ گاڑی وہاں سے چل پڑی۔
بندہ کسی کو مارنے جاتا ہے تو یہ بھول جاتا ہے کہ وہ بھی مارا
جاسکتا ہے۔ پچھلے روز ایسے ہی دو فوجی ٹرک اس پل سے

گزرتے ہوئے تباہ ہو گئے تھے جسے مجاہدین نے ریموٹ
کنٹرول بم کے ذریعے تباہ کیا تھا۔ کبھی سب مل کر ایک کو
مارتے اور کبھی ایک نہیں مارتا، مارنے والے سب مرجاتے۔

موت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ انداز بد لنے والی محبوبہ کی
طرح پہلے یار کو چھوڑ کر اچانک دوسرے یار کے گلے لگ جاتی

سانپ اور بچھو کھان

جند زنی دودن کی مسمان

گرو دیال سنگھ کی پیش گوئی اکثر سچ ہوا کرتی تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ جبار جان کے سلسلے میں بھی پیش گوئی درست ہوتی۔ ایک نجوی کے منہ سے نکلی ہوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی لیکن ادھر بھی ہتھیار ہوں تو نہ ہونے والی بات بھی حرف آخر ہو جاتی ہے۔

○☆☆○

وہ شاداں کے ساتھ صبح تک چلتا رہا۔ سردی غضب کی تھی۔ سورج کی گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا... جیسے سورج بھی ٹھنڈا بڑ گیا ہے۔ آگ اگلنا بھول گیا ہے۔

وہ مسلسل چلتے جا رہے تھے۔ اسی لیے بدن میں ذرا گرمی تھی پھر ایک دوسرے کی محبت اور قربت گرما رہی تھی۔ اس نے پوچھا ”تم شاید تھک گئی ہو؟“

”میں پہاڑوں میں رہتی ہوں۔ تھکنا نہیں جانتی۔ تم تھک گئے ہو تو رک جاؤ۔ تھکن اتار لو۔“

”آگے کوئی بستی نظر آئے گی تو وہاں کچھ کھانے پینے کو ملے گا۔ وہ جگہ محفوظ ہوگی تو ہمیں سونے کا موقع مل جائے گا۔ آگ بھی سنکنے کو ملے گی۔“

وہ چلتے چلتے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا ”مجھے نہیں راستہ دیکھ کر چلو۔ نہیں تو تھو کر لگے گی۔“

”مجھے کبھی ٹھوکر نہیں لگے گی۔ تم سنبھالنے والے مل گئے ہو۔ میں جب بھی گروں گی، تمہاری ہی آغوش میں گروں گی۔ کل رات سے تم مجھے نئی زندگی دے رہے ہو۔“

”کل رات سے تم نے بھی میری زندگی کا رخ موڑ دیا ہے۔ میں زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ اب تمہارے ساتھ زندگی کا ایک ایک لمحہ خوب صورت لگ رہا ہے۔ پہلے صرف جہاد کرتے کرتے مرنا چاہتا تھا۔ اب تم سے اتحاد کرتے کرتے دم توڑنا چاہتا ہوں۔“

”مرنے کی بات نہ کرو۔ محبت کے قصے کہانیوں میں پیار کرنے والے مرتے ہیں۔ ہم نہیں مریں گے۔ اپنی ایک نئی کہانی بنائیں گے۔ جہاد کرنے والے صرف شہید نہیں ہوتے۔ غازی بھی ہوتے ہیں۔ محبت کرنے والے صرف مرتے نہیں ہیں۔ پیار سے جینا بھی سکھاتے ہیں۔“

”تم بہت اچھی ہو۔ جب ڈاکٹر نے مجھے کینسر کی رپورٹ سنائی تو پہلے میں بہت مایوس ہوا تھا پھر سوچا مرنا ہی ٹھہرا تو کسی بڑے مقصد کے لیے مروں گا۔ کشمیر جاؤں گا۔ جہاد کروں گا۔ اس سے پہلے کہ کینسر مجھے مارے۔ میں شہادت کا درجہ حاصل

کروں گا۔“

”خدا نے چاہا تو تم غازی بن کر زندہ رہو گے۔ ویسے تمہیں ہوا کیا ہے؟“

”دماغی تکلیف ہے۔ کبھی کبھی اچانک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کانوں سے سنائی نہیں دیتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی ریگ مال سے میرے دماغ کو رگڑ رہا ہے۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں برداشت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تکلیف کیسی بھی ہو۔ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آخر آرام آ جاتا ہے۔“

وہ اس سے اور لگ کر چلنے لگی۔ بڑی محبت سے بولی۔ ”میں تمہیں کسی وید کے پاس لے جاؤں گی۔ تمہارے سر میں تکلیف ہوگی تو تمہارا سراپنہ سینے میں چھپا لوں گی۔“

وہ چلتے چلتے رک گئے۔ ایک جگہ اونچائی پر درختوں کے پیچھے دھوئیں کی ایک لکیر سی آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی۔ جہاں آگ اور دھواں ہوتا ہے۔ وہاں انسانی آبادی ہوتی ہے۔ چوبیسے چلتے ہیں۔ چینیوں سے دھواں نکلتا رہتا ہے۔ شاداں نے کہا ”ادھر بستی ہے۔ آؤ چلیں۔“

وہ راستہ بدل کر ادھر جانے لگے۔ وہ بولا ”ہم پہلے اس بستی کو دور سے دیکھیں گے۔ وہاں سوچ سمجھ کر جائیں گے۔“ وہ اونچائی پر چڑھنے لگے۔ شاداں نے کہا ”میں اکیلی وہاں جاؤں گی۔ تم کہیں چھپ کر رہو گے۔ خطرہ تمہارے لیے ہے۔ میرے لیے نہیں ہے۔“

”پہلے میں وہاں کے حالات کا جائزہ لوں گا۔ نہ تم تنہا ہو۔ نہ تمہیں تنہا جانے دوں گا۔ مرد ہوتا کس لیے ہے۔ میں عورت کو آگے بھیج کر پیچھے سے بندوق چلانے والا مرد نہیں ہوں۔“

وہ خوش ہو کر بولی ”اسی لیے تم پر مرتی ہوں۔ ویسے ہم کہاں آگے ہیں؟ یہ سوچو کہ راستہ نہیں ہے۔“

”تم تو کہہ رہی تھیں۔ دوبار سوچو جا چکی ہو۔ راستہ جانتی ہو۔“

”ہاں مگر رات کو راستہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اب پتا چلا ہے کہ یہ وہ جگہ نہیں ہے۔“

وہ بلندی پر پہنچ کر ہانپنے لگے۔ اب وہ دھواں کسی اور جگہ نظر آ رہا تھا پھر دوبار گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ چلتے چلتے رک گئے۔ شاداں نے کہا ”کبریا ادھر گڑ بڑ ہے۔ فائرنگ کی آواز سے سمجھ میں آتا ہے۔ وہاں بھارتی فوجی ہوں گے۔“

وہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ کبریا نے کہا ”اتنا سارا دھواں گھر کے چولہوں سے نہیں نکل رہا ہے۔ آگ

لگائی ہوئی ہے۔“

ایک وصیت

”میں چاہتا ہوں وہ چاروں افراد میرے

جنازے کو ضرور کدھادیں جنہوں نے مجھ سے بڑی

رقمیں قرض لی تھیں۔ انہوں نے مجھے اس حال کو

پنچایا ہے۔ میں چاہتا ہوں اب وہ کام مکمل کر کے

ہی چھوڑیں۔“

نصوحہ پیشکش: جاسوسی نشتہ ایڈیٹر

ہے۔ بھارتی حکام نے اپنے تمام کیبل آپریٹرز کو حکم دیا ہے کہ وہ پی ٹی وی کی نشریات بند کر دیں۔ یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔ ورنہ وہ ساری دنیا کی نشریات بند کر دیتے۔

اس چھوٹے سے ٹاؤن میں یہی ہو رہا تھا۔ بھارتی فوجی کرفیو کے بہانے وہاں کے مسلمانوں کو اپنے گھروں میں بند رہنے پر مجبور کر رہے تھے اور جو کشمیری مسلمان ان کی بلیک لسٹ میں تھے۔ انہیں گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن عورتیں احتجاج کرنے لگیں۔ بوڑھے ٹین ڈبے بجا بجا کر اعلان جنگ کرنے لگے۔ جوان اپنے گھروں سے نکل آئے۔ کرفیو کی خلاف ورزی ہونے لگی۔ گولیاں چلنے لگیں۔ آگ لگائی جانے لگی۔ اس کا دھواں دور دور تک پھیل رہا تھا۔

شاداں اور کبریا دور دور ہی دور سے اس دھوئیں کو دیکھ رہے تھے۔ گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس بستی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک جگہ بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں چھپ گئے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ فوج ان کی بغاوت کو دبانے اور کچلنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ افسران اور جاسوس اس ہنگامے میں یہ دیکھنا اور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کوئی ان مناظر کی وڈیو فلم اتار رہا ہے یا نہیں۔

ان کا خیال تھا جو مجاہدین کنٹرول لائن پار کر کے آتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے نقصانات پہنچانے کے علاوہ وہاں کی وڈیو فلمیں بھی بنا کر لے جاتے ہیں۔ وہ بڑے شہروں میں سی، این، این اور عالمی میڈیا کو روک نہیں پاتے۔ چھوٹے شہروں اور علاقوں میں مجاہدین کسی طرح چھپ چھپا کر وڈیو فلمیں بنا لیتے ہیں۔

شاداں اور کبریا پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے سوچ رہے تھے کہ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ وہ کسی بستی میں جا کر کچھ کھانا پینا اور رات کی نیند پوری کرنا چاہتے تھے لیکن وہاں بستی والوں کو قیامت کی نیند سلایا جا رہا تھا۔ کبریا کے پاس ایک ہی شاٹ گن تھی۔ وہ تنہا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بس اس انتظار میں تھا، کوئی موقع ملے گا تو کچھ کر گزرے گا۔

سامنے گھنے درخت دور تک تھے۔ ان کے پیچھے وہ بستی نظر نہیں آرہی تھی۔ جہاں آگ اور خون کی ہولی تھیلی جا رہی تھی۔ پتا نہیں وہاں کیوں ایسا ہو رہا تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ آزادی کے لیے لڑنے والے مقامی مسلمانوں سے بھارتی فوجیوں کا تصادم ہو رہا ہے۔

وہ ایک چھوٹا سا ٹاؤن تھا۔ بھارتی فوجیوں نے وہاں کرفیو لگایا تھا۔ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جو بھی گھر سے نکلے گا، اسے گولی مار دی جائے گی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح وہاں کے مسلمان اپنے اپنے گھروں میں بند رہیں وہ ایک دوسرے سے مل کر متحد ہو کر فوجی کارروائیوں میں مداخلت نہ کریں۔

ان کی کارروائی یہ تھی کہ جو مسلمان ان کی بلیک لسٹ میں تھے، انہیں وہاں سے فرار نہ ہونے دیا جائے۔ کرفیو میں جو بھی گھر سے نکل کر بھاگے گا، وہ ملک دشمن باغی ہوگا۔ وہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کے بہانے ناپسندیدہ افراد کو گولی مارنا چاہتے تھے اور جو باہر نہ نکلتا اور ان کی بلیک لسٹ میں ہوتا تو اسے گرفتار کر کے لے جاتے۔

کتنے ہی چھوٹے بڑے شہروں میں جن مسلمانوں کو ملک دشمن کہہ کر گرفتار کیا گیا، ان کے بارے میں یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ انہیں گرفتار کر کے کہاں لے جایا جاتا ہے۔ ان کے ماں باپ، بہن بھائی، رشتے دار انہیں تھانوں اور جیلوں میں ڈھونڈنے جاتے تھے۔ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں کو درخواستیں لکھ کر بھیجتے تھے۔ عورتیں، بوڑھے اور بچے اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ جلوس نکالتے تھے۔ فریاد کرتے تھے۔ مگر بھارت کی ہر عدالت میں انصاف کی دیوی کا جو مجسمہ رکھا جاتا ہے، اس کے ایک ہاتھ میں ترازو ہوتا ہے۔ ترازو کے پلڑے برابر ہوتے ہیں۔ یعنی انصاف برابر ہو رہا ہے لیکن اس انصاف کی دیوی کی آنکھوں پر پٹی بندھی رہتی ہے۔ یعنی قانون اندھا ہوتا ہے۔ پلڑے برابر رکھ کر سمجھتا ہے کہ انصاف برابر ہو رہا ہے۔

اپنے لوگوں کے رشتوں اور رشتوں کی واپسی کے لیے احتجاج کیا جاتا ہے۔ اندھے قانون اور ظلم و ستم کے خلاف مظاہرہ کیا جاتا ہے تو ان پر لاٹھی چارج ہوتا ہے۔ ماؤں کے سر سے چادریں نوجبی جاتی ہیں۔ بہنوں اور بیٹیوں کی آبرو لوٹی جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا اندھی ہے۔ اندھے انصاف کو نہیں دیکھ رہی ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات انٹرنیٹ کے ذریعے ساری دنیا میں دیکھی جاتی ہیں۔ کشمیریوں پر ہونے والے مظالم پر لائیو LIVE مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ انہیں دنیا دیکھتی

لگے کہ فائرنگ کہاں سے ہو رہی ہے۔

اس مجاہد کو موقع مل گیا۔ اس نے ایک پتھر کی آڑ میں پہنچتے ہی فائرنگ کی۔ تیسرے سپاہی کو بھی گولی لگی۔ باقی تین سپاہی پیچھے ہٹنے لگے۔ فائرنگ رینج سے دور جانے لگے۔ اس طرح وہ فائرنگ سے محفوظ رہ سکتے تھے لیکن کبریا اور اس مجاہد کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔

مجاہد نے سر گھما کر بڑے بڑے پتھروں کی طرف دیکھا۔ کبریا نے پتھر کے پیچھے سے ہاتھ کا اشارہ کیا پھر اشاروں سے پوچھا ”کیا تمہارے پاس اسلحہ ہے؟“

مجاہد نے اشاروں سے سمجھایا ”نہیں ہے مگر ٹھہرو۔ انتظار کرو۔“

اس نے اس بیگ کو پتھر کے پیچھے چھوڑ دیا۔ زمین پر اوندھا لیٹ کر دونوں ہاتھوں میں گن لے کر کمینوں اور گھٹنوں کے بل ریٹنگتا ہوا ادھر جانے لگا۔ جہاں ایک سپاہی کی لاش کے پاس مارٹر گن پڑی ہوئی تھی۔

وہ خطرے کو دعوت دے رہا تھا۔ جان پر کھیل کر اسلحہ لینے جا رہا تھا۔ کبریا یہ تماشا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھی گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل جھکتا ہوا پتھروں کے پیچھے سے نکل کر مجاہد کی طرف جاتے ہوئے بولا ”فکر نہ کرو۔ میں تم پر گولی چلانے والوں کو کور COVER کروں گا۔“

ادھر سے ایک سپاہی نے جراث کی۔ وہ بھی ریٹنگتا ہوا آگے آیا۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجاہد کو وہ اسلحہ مل جائے۔ وہ ذرا آگے بڑھ کر گولی چلانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کبریا نے گولی چلائی۔ دونوں ایک دوسرے سے دور تھے۔ کسی کو گولی نہیں لگ سکتی تھی۔ سپاہی زمین پر لڑھکتا ہوا دور تک آگیا۔ اس کے دور جاتے ہی مجاہد چھلانگ لگا کر لاش کے پاس آیا۔ اس کے پاس پڑے ہوئے گولیوں کے بیگ کو اور گن کو اٹھایا پھر جھک کر دوڑتا ہوا واپس آنے لگا۔ ایسے وقت کبریا نے مسلسل فائرنگ کی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی لیکن وہ آگے نہیں بڑھ رہے تھے کیونکہ کبریا کی فائرنگ کی زد میں آسکتے تھے۔

مجاہد کبریا کے پاس آگیا۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے پہلے پتھر کے پاس آئے اس کے پیچھے پڑے ہوئے بیگ کو اٹھایا پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے دوسرے پتھروں کے پیچھے شاداں کے پاس پہنچ گئے۔

شاداں گن چلا سکتی تھی لیکن نشانہ باز نہیں تھی پھر بھی اس نے ایک گن لے لی۔ وہ تین سپاہی زمین پر ریٹنگتے ہوئے چھوٹے بڑے پتھروں کے پیچھے چھپتے ہوئے آرہے تھے۔ کبریا

اس ٹاؤن میں تین مجاہدین چھپے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا ”یہاں بھارتی فوجیوں کی تعداد پچیس تیس سے زیادہ نہیں ہے۔ یہاں صرف چار کشمیری جوانوں کے پاس اسلحہ ہے اور ہم تینوں مسلح ہیں۔ ان فوجیوں کو منتشر کر کے انہیں مختلف سمت لے جانا چاہیے۔ کچھ ادھر جائیں گے۔ کچھ ادھر آئیں گے۔ وہ تقسیم ہو جائیں گے۔ اس طرح ان سے نمٹا جاسکے گا۔“

انہوں نے یہی کیا۔ وہ تینوں مختلف سمت چلے گئے۔ ایک نے ایک ہاڑی ٹیلے پر چڑھ کر چیختے ہوئے اور ایک چھوٹے سے بیگ کو فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا ”یہ دیکھو۔ اس بیگ میں تمہارے ظلم و ستم کی تصویریں ہیں۔ وڈیو فلم ہے۔ اسے دیکھ کر دنیا تم پر تھو کے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے ٹیلے سے نیچے چھلانگ لگائی پھر چیختے ہوئے ایک طرف بھاگنے لگا ”میں جا رہا ہوں۔ جس نے ماں کا دودھ پیا ہے۔ وہی میرے پیچھے آئے گا۔“

ایک افسر تقریباً دس سپاہیوں کو لے کر ادھر دوڑ لگاتے ہوئے حکم دینے لگا ”تم ادھر جاؤ اور تم ادھر سے جاؤ۔ رینج پر آتے ہی اسے گولی مار دو۔“

بستی کے دوسری طرف دوسرے مجاہد نے بھی یہی کیا۔ اس نے بھی ایک چھوٹے سے بیگ کو فضا میں لہراتے ہوئے چیختے ہوئے کہا ”تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ظلم و ستم کی تصویریں اتاری جائیں مگر تم دیکھو گے۔ ساری دنیا دیکھے گی۔ میں یہ وڈیو فلم لے جا رہا ہوں۔“

وہ کہتا ہوا دوڑتا ہوا وہاں سے جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے بھی دس بارہ سپاہی دوڑتے ہوئے چلے گئے۔ اس وڈیو فلم کی بہت اہمیت تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ فلم کسی کے ہاتھ لگے۔ اس لیے وہ کشمیری مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔

ان دونوں مجاہدین نے انہیں جھانسا دیا تھا۔ ان کے پاس کوئی وڈیو فلم نہیں تھی۔ تیسرا مجاہد بھی ایک بیگ اٹھائے دوڑتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔ جہاں پتھروں کے پیچھے شاداں اور کبریا چھپے ہوئے تھے۔

اس مجاہد کے ایک ہاتھ میں بیگ تھا اور دوسرے ہاتھ میں گن تھی۔ بھارتی فوجی فائرنگ کرتے ہوئے اس کے پیچھے آرہے تھے۔ اس بیچارے کو پلٹ کر فائر کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ جب وہ رینج میں آنے لگے تو کبریا نے شاٹ گن سے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ ایک سپاہی گرا۔ دوسری گولی چلی۔ دوسرا سپاہی گرا۔ وہ سب رک گئے۔ ادھر ادھر دیکھنے

شاداں اور مجاہد کے ساتھ بڑے پتھروں اور گھنی جھاڑیوں کے پیچھے چھپتا ہوا ادھر سے جانے لگا۔ دوسری طرف راستہ تھا۔ وہ چھپتے ہوئے جا رہے تھے۔ تعاقب کرنے والوں کو پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے۔

ان کے ایک طرف ایک چھوٹی پہاڑی کی بلندی تھی جو دور نہ جانے کہاں تک گئی تھی۔ دوسری طرف اوپکی پچی ڈھلان تھی۔ وہ بستی سے دور ہو گئے تھے۔ انہیں صرف دھواں نظر آ رہا تھا۔

محمد مجاہد 03045503086

وہ سمجھ رہے تھے کہ تعاقب میں آنے والے تین سپاہی بھٹک گئے ہیں یا بستی کی طرف چلے گئے ہیں لیکن وہ اس پہاڑی پر چڑھ کر آ رہے تھے۔ انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن اونچائی پر پہاڑی راستہ اتنا دشوار تھا کہ وہ وہاں اپنا توازن قائم رکھ کر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ صحیح نشانہ نہیں لگا سکتے تھے پھر یہ کہ ان کے چھپنے کے لیے وہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔

وہ تینوں اونچائی پر آگے کھلی جگہ کی طرف جانے لگے۔ وہاں چھپ کر فائر کرنے کی جگہ بھی ایسے وقت ایک چھوٹا سا پتھر ایک سپاہی کی ٹھوک سے لڑھک گیا۔ نیچے کی طرف آواز پیدا کرتے ہوئے جانے لگا۔ نیچے سے ان تینوں نے چونک کر اوپر کی طرف دیکھا۔ وہ اوپر تھے۔ سر پر تھے۔ محاورے کے مطابق سر پر آپہنچے تھے۔

ان تینوں نے بیک وقت اوپر سے فائرنگ کی۔ نیچے سے بھی جوابی فائرنگ ہوئی۔ ادھر ایک سپاہی کو گولی لگی۔ وہ بلندی سے چیتا ہوا گرا۔ ادھر مجاہد کے حلق سے کراہ نکلی۔ اوپر سے آنے والی گولی اس کے سر پر لگی تھی۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔

کبریا لپک کر اس کے پاس آیا۔ دوسرے سپاہی کو بھی گولی لگی تھی۔ شاداں تیسرے پر فائرنگ کر رہی تھی۔ کبریا اس مجاہد کے پاس آکر جھک گیا۔ اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بیگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ”ویڈیو۔ ویڈیو فلم ہے۔ اسے لے جاؤ۔“

اس کے گلے میں ایک لاکٹ والی چین تھی۔ وہ اپنے ایک لرزتے ہوئے ہاتھ سے لاکٹ کو کھولنا چاہتا تھا۔ کبریا نے اس کے ہاتھ سے لاکٹ کو لے کر کھولا۔ اندر ایک بوڑھی خاتون کی تصویر تھی۔ اس نے اسے مجاہد کے ہاتھ میں دیا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے تصویر کو دیکھا پھر اٹک اٹک کر آواز دی ”اے۔ اے۔ اے۔ ماں۔۔۔۔۔“

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ گردن ایک طرف اٹھک گئی ”اماں! جسے تو نے پیدا کیا وہ ابھی تجھے پکار رہا تھا۔ تو نے کس دل سے سینے پر پتھر رکھ کر بیٹے کو جہاد کے لیے بھیجا تھا۔ کشمیر کو جنت ارضی کہا جاتا ہے۔ تو نے جنتی بیٹے کو جنت کو جیت لانے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ جیت چکا ہے۔ اب جنت میں ہی رہے گا۔۔۔“

شاداں دوسری گن اٹھا کر اسے تیسرے اور آخری سپاہی پر فائرنگ کر رہی تھی۔ اتنی دیر سے اس کی ایک گولی بھی سپاہی کو نہیں لگی تھی لیکن انارڈی پن کے باوجود وہ اسے بری طرح دہشت زدہ کر چکی تھی۔ وہ پہاڑی پگڈنڈی پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے دائیں بائیں جانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ جب اس نے ایک طرف جانے کی کوشش کی تو خوف اور بدحواسی سے لڑکھڑا گیا۔ وہاں سے چیتا ہوا نیچے کی طرف لڑھکتا ہوا شاداں سے کچھ دور آکر زمین پر گر پڑا۔ گرتے ہی دم نکل گیا۔ کبریا نے مجاہد کے بیگ کو کھول کر دیکھا۔ اندر ایک جوڑا لباس تھا۔ ایک ٹارچ لائٹ اور درجنوں گولیاں۔ ایک ویڈیو کیسٹ بھی تھا۔ کیرا کسی دوسرے مجاہد کے پاس ہو گا۔ اس کے پاس صرف وہ کیسٹ تھا اور اس نے آخری سانسوں میں کبریا سے کہا تھا کہ وہ ویڈیو کیسٹ لے جائے۔

وہ مجاہدین کی محنتوں کا ثمر تھا۔ ان کی امانت تھی۔ اس ویڈیو کیسٹ کو مجاہدین کی کسی تنظیم تک پہنچانا لازمی تھا اور کبریا کا فرض بھی تھا۔ اس نے کیسٹ کو اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا ”بستی کی طرف سے فائرنگ کی آواز نہیں آرہی ہے۔ پتا نہیں وہاں کے کیا حالات ہیں۔ ہمیں یہاں سے جلد نکل جانا چاہیے۔“

وہ ایک چادر نکال کر اس مجاہد کو سر سے پاؤں تک ڈھانپنے لگا۔ شاداں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولی ”کیا ہم اسے یہیں چھوڑ دیں گے؟“

کبریا کا سر جھک گیا۔ وہ بڑے دکھ سے بولا ”ہم اٹھا کر نہیں لے جاسکتے۔ تم اٹھا نہیں سکتیں اور میں اکیلا ہوں۔ آگے کہیں کشمیری مسلمانوں سے ملاقات ہوگی تو ہم اس مجاہد کا ذکر کریں گے۔ ہو سکتا ہے وہ اس کی میت اٹھا کر لے جائیں۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑا ہو کر ذرا سا ڈگمگا گیا۔ ایک ہاتھ سے سر تھام کر دو سرا ہاتھ آگے بڑھا کر یوں راستہ ٹٹولنے لگا۔ جیسے اندھا ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ شاداں کی آواز جیسے بہت دور سے سنائی دی ”کیا ہوا؟ کبریا تمہیں کیا ہو رہا ہے؟“

وہ ایک پتھر کے پاس پہنچ کر گرنے لگا۔ اب اسے شاداں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کیا ایسے ہی موت آتی ہے؟ آنکھوں کی روشنی بجھتی ہے۔ اس دنیا کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ دماغ چپ ہو جاتا ہے مگر چپ نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی ریگ مال سے اسے رگڑ رہا ہو۔ وہ شدید تکلیف کے باعث تڑپ رہا تھا۔ کسی گہری تاریک دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ اس کی شاداں نے بڑی محبت اور بڑے جذبے سے کہا تھا کہ اس پر دورہ پڑے گا، اس کے سر پر عذاب اترے گا تو وہ اس کے سر کو اپنے سینے میں چھپالے گی۔ اسے دل کی دھڑکنیں سنائے گی۔ جیسے ماں لوریاں سناتی ہے۔

اور شاداں ایسا کر رہی تھی۔ اسے دونوں بانہوں میں سمیٹ رہی تھی۔ اس کے سر کو اپنے سینے میں چھپا کر سہلا رہی تھی۔ اپنے دل کی دھڑکنوں سے اس کا علاج کرنا چاہتی تھی۔ پاگل تھی۔ دیوانی تھی۔ محبت میں جان دے دو۔ تب بھی اپنی جان کی جان نہیں بچائی جاسکتی۔ کیا ڈاکٹر کی رپورٹ درست ہو رہی تھی؟ نہیں۔ ابھی نہیں۔ اے اجل! ذرا دم لے۔



جوان بیٹیاں گھر سے بھاگتے وقت کبھی یہ نہیں سوچتی کہ ان کے پیچھے بوڑھے ماں باپ کیسی ذلتیں اٹھائیں گے۔ لوگ ان بوڑھوں کو پتھر نہیں ماریں گے مگر طعنے مار مار کر انہیں شرم سے مرجانے پر مجبور کر دیں گے۔

شاداں کے ماں باپ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ اپنے پرائے سب ہی چھی چھی تھو تھو کر رہے تھے۔ جو اپنے ہوتے ہیں، وہ بھی کچھ کہنے اور کچھ اچھالنے کا موقع پالیتے ہیں۔ اپنا بیٹا مولاداد غصے سے گرج رہا تھا۔ ماں باپ سے کہہ رہا تھا ”ایسی بیٹی پیدا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ جب اسے پیدا کرنا تھا تو مجھے اس بے غیرت کا بھائی بنا کر کیوں پیدا کیا؟“

باپ نے کہا ”کیا بکواس کر رہا ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسی اولاد پیدا کر رہا ہے۔ اولاد تو جوان ہو کر گل کھلاتی ہے۔ اپنے رنگ ڈھنگ دکھاتی ہے۔“

اس کی ماں نے کہا ”محلے بڑوس والوں کو کہنے کا موقع مل گیا ہے۔ ہماری بیٹی بے حیائی کا ثبوت چھوڑ گئی ہے۔ ورنہ تھوڑی بہت بے حیائی ہر گھر میں ہوتی ہے۔ دوسرے ظاہر نہیں ہوتے۔ اس لیے ننگے نہیں کھلاتے۔ بیٹی ہمیں ننگا کر گئی ہے۔“

باپ نے کہا ”کیا تالی ایک ہاتھ سے بجتی ہے۔ دوسرا ہاتھ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ بدنام کرنے والے یہ کیوں نہیں

کہتے کہ وہ بھاگی نہیں ہے، کوئی اسے بھگا کر لے لیا ہے۔ پہلے بھی دو لڑکیاں اس بستی سے غائب ہو گئی تھیں۔ سب نے یہی کہا تھا کہ وہ لڑکیاں بے حیا تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی لاش ملی تو سب کو چپ لگ گئی۔ سب کی سمجھ میں آیا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ جب میری بیٹی کی لاش ملے گی تو۔۔۔“

وہ آگے نہ بول سکا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگا۔ غصے سے گرجنے والے بیٹے نے دیکھا، ماں بھی رونے لگی تھی۔ اس نے کہا ”خدا تیری زبان مبارک کرے۔ وہ مرجائے گی۔ ظالموں کا نشانہ بن جائے گی اس کی عزت کی دھجیاں اڑ جائیں گی تو ہم فخر سے کہہ سکیں گے کہ تیری بیٹی، میری بہن بے حیا نہیں تھی۔ اس سے بے حیائی کی گئی ہے۔“

بوڑھے نے روتے ہوئے کہا ”ہاں یوں آبرو لوٹنے کا صدمہ ہوتا ہے۔ شرم آتی ہے مگر جوان بیٹی پر بے حیائی کا الزام تو نہیں آتا۔ جیسا اب آرہا ہے۔“

مولاداد بے چینی سے نہل رہا تھا۔ کہنے لگا ”بڑی دیر سے میں یہی سوچ رہا ہوں کہ شاداں ایسی نہیں تھی تو ایسا ہوا کیوں؟ کس نے ایسا کیا ہے؟“

باپ نے کہا ”ہماری بستی میں ایک ہی بے غیرت آتا ہے اور وہ ہے جبار جان۔“

مولاداد نے کہا ”اس کا نام سن کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ وہ فوجیوں کا مخبر ہی نہیں دلال بھی ہے۔ وہ ادھر آئے گا تو میں اسے دیوچ لوں گا۔ اس سے اگلا کر رہوں گا کہ میری بہن کو کہاں لے گیا ہے اور اس سے پہلے دو لڑکیوں کو کہاں لے گیا تھا۔ وہ سچ نہیں بولے گا تو میں اسے مار ڈالوں گا۔“

ماں نے کہا ”اسے مارنے کے بعد کیا تو بچے گا۔ فوجی درندے تیرا قیمہ بنادیں گے۔“

”میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر یہ بدنام کرنے والے مان جائیں گے کہ ہم بے غیرت نہیں ہیں۔ جو ہماری غیرت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ ہم اسے مار کر مرجاتے ہیں۔“

”تو بھی جا۔ مرجا۔ شاداں گئی تو بھی چلا جا۔ ہم بوڑھوں کو بھوک سے اور بیماری سے مرنے کے لیے چھوڑ دے۔ ہم نے اسی دن کے لیے تجھے پیدا کیا تھا۔“

باپ نے کہا ”بیٹی کا نقصان ہو گیا۔ اب بیٹے کا نقصان برداشت نہیں ہوگا۔ بیٹا ہوش میں رہنا۔ کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا۔ ہم صدمے سے مرجائیں گے۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔ پڑوسن کی آواز سنائی دی۔
”شاداں کی ماں فوجی آرہے ہیں۔ بیٹے کو کہیں بھیج دے۔ میں
نے تو اپنے بیٹے کو بھگا دیا ہے۔“

جب کبھی فوج کے آنے کی اطلاع ملتی تو نوجوان بیٹے اور
بھائی گھر چھوڑ کر کہیں چلے جاتے تھے یہ اندیشہ رہتا تھا کہ
فوجیوں کی بلیک لسٹ میں ان کا نام ہو سکتا ہے۔ وہ انہیں پکڑ
کر لے جائیں گے انہیں اذیتیں دیں گے پھر کہیں مرنے کے
لیے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

مولاداد کلباڑی اٹھا کر جانے لگا۔ ماں نے راستہ روک
کر پوچھا ”کلباڑی کیوں لے جا رہا ہے؟“
”ہمیں ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ کیا وہ
ماریں گے تو میں چپ چاپ مر جاؤں گا؟“
”تجھے ان کا سامنا نہیں کرنا ہے۔ کہیں جا کر شام تک
چھپنا ہے۔“

مولاداد نے کلباڑی کو دیکھا۔ اس کی دھار پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے ماں سے کہا ”گھر میں لکڑیاں نہیں ہیں کیا کھانا
نہیں پکائے گی؟ رات کو انگلیٹھی نہیں جلانے گی؟ میں لکڑیاں
کاٹ کر لاؤں گا۔“

وہ ماں کو ایک طرف ہٹاتا ہوا ”دروازہ کھول کر باہر
آگیا۔ باہر خاموشی اور رویرانی تھی۔ مکانوں کے دروازے بند
ہو چکے تھے۔ دکانیں آدھی کھلی، آدھی بند تھیں۔ وہ تیزی
سے چلتا ہوا ایک طرف جانے لگا۔ دور ایک نہر کے پاس فوجی
گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ مسلح سپاہی گاڑی سے اتر کر بستی کی
طرف آرہے تھے۔ بستی کے مکانات پہاڑی کے نشیب و فراز
میں ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔

وہ سپاہی تعداد میں بارہ تھے۔ چار چار کی ٹولی میں بٹ کر
بستی کے مختلف حصوں میں آگئے۔ جبار جان تین سپاہیوں کے
ساتھ شاداں کے محلے میں آیا۔ پہلے اسی کے گھر کے
دروازے پر دستک دی۔ ماں نے دروازہ کھولا تو جبار جان نے
بڑے ادب سے جھک کر کہا ”سلام ماں جی۔“

وہ اسے ناگواری سے دیکھ کر بولی ”مسلمان السلام علیکم
کہتے ہیں۔ تو تو سلام کرنا بھی بھول گیا ہے۔ خالی نام کا مسلمان
ہے۔ یہاں کیا لینے آیا ہے؟“

”میرے پیچھے سپاہیوں کو دیکھ رہی ہے۔ میں سرکاری
کام سے آیا ہوں۔ ایک آتنگ وادی کی تلاش ہے۔ ہمیں گھر
کی تلاشی لینا ہے۔“

وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ سپاہیوں کے ساتھ اندر
آگیا۔ وہ تین کمروں کا مکان آدھا پتھروں سے اور آدھا

لکڑیوں سے بنا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک کمرے میں جا کر دیکھنے
لگا۔ دراصل شاداں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے بارے میں
کچھ سننا چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا ”تیرے بچے کہاں ہیں؟“
”وہ بچے نہیں ہیں۔ میرا جوان بیٹا مزدوری کے لیے شہر
گیا ہے۔“

”اور جوان بیٹی؟“ اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر
پوچھا۔

وہ جل کر بولی ”یہ تجھے معلوم ہو گا اگر تو مسلمان ہے۔
تیرے اندر ذرا سا بھی ایمان رہ گیا ہے تو کلمہ پڑھ کر بتا دے
میری بیٹی کہاں ہے؟“

”کیوں الٹی بات کرتی ہے۔ اپنی بیٹی کی بات مجھ سے
پوچھتی ہے۔ کیا وہ گھر سے بھاگ گئی ہے؟“

”یہ ہماری بیٹیوں اور بہنوں پر الزام ہے کہ وہ گھر سے
بھاگ جاتی ہیں۔ انہیں فوجی اٹھا کر لے جاتے ہیں یا ان کا
جھوٹا کھانے والے دلال انہیں بہلا پھسلا کر لے جاتے
ہیں۔“

”میں تجھ سے جھگڑا نہیں کروں گا۔ تو میری ماں کے برابر
ہے۔ کلمہ پڑھ کر سچ بولتا ہوں۔ لا الہ الا اللہ۔ ہمارا تمہارا محمد
رسول اللہ۔“

”چپ کافر کی اولاد کیوں مسلمان کہلاتا ہے۔ تجھے تو
ایک کلمہ بھی یاد نہیں ہے۔“

”ماں جی کلمے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا
ہوں۔ تیری بیٹی پر کسی فوجی نے کوئی ظلم نہیں کیا ہے اگر وہ
کسی ریسٹ ہاؤس میں یا کسی کالج میں، کسی افسر کے پاس ہوتی
تو مجھے معلوم ہو جاتا میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہتا
ہوں۔ ایک آتنگ وادی اسے بھگا کر لے گیا ہے۔“

”کتنے افسوس کی بات ہے۔ ان فوجیوں کی طرح تو بھی
مجاہدوں کو آتنگ وادی کہتا ہے۔ کیا تو نے میری بیٹی کو کسی
مجاہد کے ساتھ دیکھا ہے؟“

”میں نے نہیں دیکھا ہے۔ ایک جاسوس نے رپورٹ
دی ہے۔ جس آتنگ وادی کو ہم تلاش کر رہے ہیں۔ اسے
جوان لڑکی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ وہ گرفتار ہو گیا مارا جائے
گا تو تیری بیٹی تجھے مل جائے گی۔“

”اللہ نہ کرے، وہ مجاہد مارا جائے۔ اگر میری بیٹی کسی
مجاہد کے ساتھ گئی ہے تو پھر عزت سے گئی ہے ایک ماں کی دعا
ہے کہ مجاہد پر کوئی آنچ نہ آئے۔“

وہ سپاہیوں کے ساتھ باہر جانے لگا۔ دروازے پر شاداں
کا باپ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جبار جان سے پوچھا ”کیا تو جانتا

ہے موت کیسے آتی ہے؟ اور کب آتی ہے؟

وقت اس نے آہٹ سن کر سر گھماتے ہوئے دیکھا۔ مولا داد ایک ہاتھ میں کلباڑی اٹھائے اس کی طرف دوڑتا آ رہا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

وہ گاڑی کی طرف سے دوڑتا آ رہا تھا۔ یہ ادھر رانفل لینے نہیں جاسکتا تھا۔ ایک طرف بھاگتے ہوئے بولا ”اے کیا پاگل ہوا ہے۔ مجھے مارنے آ رہا ہے تو جانتا ہے میں کون ہوں۔“

مولا داد نے کہا ”جانتا ہوں۔ سبھی جانتے ہیں تو فوجیوں کا دلال ہے۔ زندہ رہنا چاہتا ہے تو بچتا دے۔ شاداں کہاں ہے؟“

”ارے یہی بتانے تیرے گھر گیا تھا۔ ابھی جا کے اپنی ماں سے اپنے باپ سے پوچھ لے۔ جس آنگ وادی کو ہم تلاش کر رہے ہیں۔ وہ تیری بہن کو لے گیا ہے۔“

”تو جھوٹ بولتا ہے۔ باتیں بنا کر دھوکا دیتا ہے۔ میں دھوکا نہیں کھاؤں گا۔“

”میں سچ بول رہا ہوں۔ ہمارے جاسوس نے اپنی آنکھوں سے تیری بہن کو اس کے ساتھ دیکھا ہے۔ شاداں اس کے ساتھ دوسری پہاڑی پر تھی۔ وہاں پہنچنے تک وہ دونوں کسی دوسری طرف نکل گئے تھے۔“

”تو نے ان دو لڑکیوں کے بارے میں بھی بستی والوں سے یہی کہا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہیں لیکن ایک لڑکی کی لاش دیکھ کر تیرا جھوٹ کھل گیا تھا۔ تیرے دلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ تجھے مرجانا چاہیے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ ایک بڑھک لگا کر فضا میں کلباڑی لہراتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ جبار جان ایک بڑے سے درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ فوراً ہی چھلانگ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کلباڑی کا پھل درخت کے تنے میں پیوست ہو گیا۔ اگر ایک ساعت کی بھی دیر ہوتی تو وہ پھل اس کے جسم میں پیوست ہو جاتا۔ وہ ایک دم سے بوکھلا گیا۔ موت کیسے آتی ہے؟ کب اچانک آ جاتی ہے؟

اس پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ مرتے مرتے بھی اپنی زندگی کے لیے لڑنا ضروری ہوتا ہے۔ کلباڑی کا پھل درخت کے تنے میں ذرا گہرائی تک پیوست ہو گیا تھا۔ اسے نکالنے میں ذرا دیر لگی۔ جبار جان چھلانگ لگا کر اس سے لپٹ گیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ایک دوسرے کو مارنے لگے۔ ایک دوسرے سے مار کھانے لگے۔

مولا داد ٹکڑا جوان تھا۔ محنت و مشقت کرنے والا مزدور

اس نے بوڑھے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایسا لگا بوڑھے کے اندر سے گرد و بال سنگھ بول رہا ہے ”یہ کوئی نہیں جانتا۔ کیسے آتی ہے؟ اور کب اچانک آ جاتی ہے مگر تجھے مرنا ہے۔ بھگوان کرے تجھے شانتی سے موت آئے۔ ہری اوم۔ ہری اوم۔“

بوڑھے نے کہا ”میں تیرے بھلے کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ تو نہیں جانتا۔ موت کیسے اچانک آ جاتی ہے اور تیرے بھلے کے لیے تجھے سمجھاتا ہوں۔ کم از کم مرتے وقت تو کلمہ پڑھنا چاہیے اور تجھے ایک کلمہ بھی یاد نہیں ہے۔ میں تجھے پڑھاتا ہوں۔ پڑھ لے۔ یاد کر لے۔“

وہ ”اونہ“ کہتا ہوا اس سے منہ پھیر کر سپاہیوں کے ساتھ جانے لگا۔ اسے اپنے پیچھے بوڑھے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں کلمہ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ وہ کلمے سے دور نکل آیا۔ دل عجیب طرح گھبرانے لگا تھا۔ اس کی سمجھ نہیں آتا تھا، کبھی کبھی اسے کیا ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ پورے یقین کے ساتھ موت کو بھول جاتا تھا جیسے سب بھول جاتے ہیں۔ کبھی موت یاد آتی تو دل کہتا تھا۔ وہ نہیں مرے گا۔ ابھی پتا نہیں کتنے دنوں تک۔ کتنے برسوں تک جئے گا۔ اکثر لوگ ایسا ہی سوچتے ہیں۔

جو تپتی گرد و بال سنگھ کی پیش گوئی اسے تذبذب میں رکھتی تھی۔ اس کی پیش گوئیاں اکثر درست ہوا کرتی تھیں۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ پیش گوئی بھی درست ہوتی لیکن نامعلوم سی بے چینی اور گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔

اس نے سپاہیوں سے کہا ”گھروں کی تلاشی لو۔ میں گاڑی کی طرف جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کروں گا۔“

وہ نہر کی طرف جانے لگا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ پچھلی رات وہ کس طرح مرتے مرتے بچا تھا۔ شاداں کی مدد کرنے والے مجاہد نے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔ خوش قسمتی سے ایک بھی گولی نہیں لگی تھی۔ گرد و بال سنگھ یہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ اسے موت کیسے آئے گی لیکن ان کی باتوں سے یہ امید بندھی تھی کہ وہ کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جائے گا۔ طبعی موت مرے گا۔ مخبری کرنے اور ایک مجاہد کو تلاش کرنے کی مہم جوئی میں اسے جانی نقصان نہیں پہنچے گا۔

وہ ایک ڈھلان سے اتر کر گاڑی کے پاس آ گیا۔ پیچھے والی سیٹ پر اپنی رانفل رکھ کر نہر کے کنارے آیا پھر وہاں بیٹھ کر منہ دھونے اور منہ میں پانی بھر کر کلیاں کرنے لگا۔ ایسے

ایک افسر دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ مولا داد کی لاش کو دیکھ کر جبار جان سے بولا ”ابے اوکتے۔ تجھے رائفل دی تھی اور تو کلباڑی سے مرنے جا رہا تھا۔“ وہ ہنسنے لگا پھر پھپھنوں کی پوری قوت سے زور لگا کر ہنسنے لگا۔ افسر نے ناگواری سے کہا ”یہ پہلا آدمی ہے۔ جسے کتا گھو تو ہنسنے لگتا ہے۔“

وہ ہنستا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا پھر بولا ”جتنی گالیاں دینا چاہو دیتے رہو۔ میں تو اس بات پر ہنس رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں کہ کبھی کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جاؤں گا۔ میں کل بھی بچ گیا تھا اور آج بھی بچ گیا۔ بس یقین ہو گیا۔ قدرت مارے گی تو مروں گا۔ کوئی مائی کالا مجھے مار نہیں سکے گا۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ اس دیرانے میں اس کی ہنسی دور دور تک گونج رہی تھی۔



کبریا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ کسی چھوٹے سے لکڑی کے مکان میں تھا۔ ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ کبل کے اندر شاداں اس سے لپٹے ہوئے سو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا پتا نہیں ہم کتنی دیر سے سو رہے ہیں۔ یہ معلوم کرنا چاہیے کہ یہ جگہ محفوظ ہے یا نہیں؟

اسے یاد آ رہا تھا کہ اسے کس طرح دورہ پڑا تھا۔ وہ عارضی طور پر بصارت سے اور سماعت سے محروم ہو گیا تھا۔ دماغی تکلیف سے دوچار ہوا تھا پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کا سر شاداں کے سینے پر تھا۔ وہ اسی پہاڑی کے دامن میں اسے دونوں ہاتھوں سے سینے اپنے سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ اکیلی کیا کر سکتی تھی۔ ایک مجاہد تھا۔ وہ شہید ہو چکا تھا۔ باقی تین دشمنوں کی لاشیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں۔ ایسی نازک حالت میں کوئی اس کا ساتھ دینے والا اور اس کے بیمار کو اسپتال پہنچانے والا نہیں تھا۔

وہ خود ہی ہوش میں آ گیا۔ شاداں نے خوش ہو کر کہا۔ ”خدا کا شکر ہے۔ تم ہوش میں آ گئے۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ ایسے وقت تمہارے کسی کام نہ آسکی۔“

وہ بولا ”یہاں ساری دنیا ہوتی تو وہ بھی میرے کام نہ آتی۔ بیماری سے ڈاکٹر بچاتا ہے۔ جو اپنے ہوتے ہیں۔ وہ بیمار کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں اور تم نے بڑی محبت سے یہ فرض ادا کیا ہے۔“

اس نے اپنا بیگ کھول کر دوائیں نکالتے ہوئے کہا۔ ”ایک گولی اور ایک کیپول کھانا ضروری ہے مگر پانی نہیں

تھا۔ اس پر بھاری پڑ رہا تھا۔ ایک بار اس نے جبار جان کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ سخت زمین پر گرنے کے باعث کمر اور ریڑھ کی ہڈی میں ایسی چوٹیں لگیں کہ وہ فوراً ہی اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ مولا داد تیزی سے پلٹ کر دوڑتا ہوا درخت کے پاس آیا۔ کلباڑی کے پھل کو اس کے تنے سے نکالنے لگا۔ ایک زوردار جھٹکے سے کلباڑی نکل کر ہاتھوں میں آ گئی۔

جبار جان تکلیف سے کراہتا ہوا آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا پھر زوردار بڑھک سن کر چونک گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں کلباڑی لیے سر پر آن پہنچا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک چیخ مار کر پھر لیٹ گیا۔

محمد مجاہد بھٹہ 03045503086

کلباڑی کا تیز دھار پھل سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ان لمحات میں یہ خوش فہمی ختم ہو گئی کہ وہ طبعی موت مرے گا۔ کسی کے ہاتھوں نہیں مرے گا۔ آدمی جیسا سوچے۔ موت ویسے نہیں آتی پھر کیسے آتی ہے؟

ایسے آتی ہے۔ جیسے آرہی تھی۔ مسلسل زندہ رہنے کی خوش فہمی ختم ہو رہی تھی۔ وہ چیخنے لگا ”رک جاؤ! مجھے نہ مارو۔ میں بچ بول رہا ہوں۔ میری بات سن لو۔“

آدمی موت سے کسی طرح بچنے کے لیے اور جھوٹ بولتا ہے۔ وہ کسی طرح بچ نکلنا چاہتا تھا۔ تقدیر بچائے گی تو بچے گا۔ ورنہ موت تو کبھی نہیں چھوڑتی۔

کلباڑی سر سے اونچی ہو گئی تھی اور اب نیچے آ کر اس کے جسم میں پیوست ہونے والی تھی۔ ایسے ہی وقت گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ مولا داد کے ہاتھوں میں کلباڑی اٹھی گی اٹھی رہ گئی۔ وہ چند ساعت کے لیے اسی طرح ساکت رہا پھر کلباڑی اس کے دونوں ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑی۔ دوسری گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ مولا داد کے حلق سے آخری کراہ نکلی پھر وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ موت کیسے آتی ہے؟

ایسے آتی ہے۔ بڑی ہرجائی ہوتی ہے۔ پہلے یار کو چھوڑ کر دوسرے یار سے لپٹ جاتی ہے۔ بڑی نا انصافی کرتی ہے۔ ظالم کو مارنا ہوتا ہے مگر غیرت مند بھائی کو مار دیتی ہے۔ کوئی موت کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

جبار جان زمین پر چاروں شانے چت پڑا دیدے پھیلائے آسمان کو تک رہا تھا۔ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ یوں سانسوں کی آمد و رفت سے خود کو یقین دلا رہا تھا کہ ابھی زندہ ہے۔ موت آتے آتے پلٹ گئی ہے۔ یہ ابھی نہیں آئے گی پھر کبھی آئے گی۔

ہے۔ پتا نہیں یہ کیسپول پانی کے بغیر حلق سے اترے گا یا نہیں؟

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگی۔ دور تک ہریالی تھی۔ پہاڑ تھے۔ کسی پہاڑ سے پانی کا چشمہ نہیں پھوٹ رہا تھا۔ دور تک کوئی دریا یا نہر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر بیٹھ گئی۔ کبریا نے کہا ”کوئی بات نہیں۔ میں پانی کے بغیر انہیں نگلنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

اس نے ہونٹوں کو بند کیا۔ منہ کے اندر تھوڑا سا لعاب دہن جمع کیا پھر ایک گولی منہ میں ڈالی۔ اسے نگلنے لگا۔ نگلتے وقت ٹھسکا سا لگا مگر گولی حلق سے اتر گئی۔ وہ کھانسنے لگا۔ جب کھانسی رک گئی تو اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کیسپول کو دیکھا۔ شاداں نے کہا ”کیسپول بڑا ہے۔ حلق میں پھنس جائے گا۔“

”ہاں پھنسے گا مگر کسی طرح نگلنا ہوگا۔ کوشش کرتا ہوں۔“

وہ ہونٹ بند کر کے پھر لعاب دہن جمع کرنے لگا۔ وہ بولی ”ذرا سا لعاب ہوتا ہے۔ گولی نہ نگل سکے۔ اسے کیسے نگلو گے؟“

وہ منہ کھول کر کیسپول نگلنا چاہتا تھا۔ شاداں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ گھٹنوں کے بل اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ اس کے چہرے پر جھک گئی۔ اس کے دونوں ہونٹ بند تھے پھر اس نے کیسپول لے کر اس کے منہ میں ڈالا پھر اپنے منہ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ ایک گلاس دوسرے گلاس پر اونڈھا ہو گیا۔ اس گلاس کی تری اس گلاس میں اترنے لگی۔ کیسپول حلق سے اتر گیا۔

ایک مشکل بڑے پیار سے آسان ہو گئی۔ کوئی آنکھوں سے دل میں سماتا ہے۔ وہ حلق سے دل میں اترنے لگی۔ کبریا نے کہا ”آج تک کسی نرس نے کسی مریض کو اتنے پیار سے دوا نہیں کھلائی ہوگی۔“

وہ شرمانے اور مسکرانے لگی۔ اس کا بیگ اٹھا کر بولی ”کیا چلنے کے قابل ہو؟“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جب دورہ پڑتا ہے۔ تب تکلیف ہوتی ہے تم میری حالت دیکھ چکی ہو مگر آرام آنے کے بعد پہلے جیسی توانائی بحال ہو جاتی ہے۔“

وہ دونوں چلتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ مسجد کے آس پاس ساٹھ ستر مکانات تھے۔ نمازی عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے

تھے انہیں دور سے آتے دیکھ کر رک گئے۔ کبریا نے ان کی طرف آتے ہوئے سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ ایک نے پوچھا ”مسافر ہو؟ کہاں سے آرہے ہو؟“

کبریا نے کہا ”منگور سے۔“

”کہاں جاؤ گے؟“

”ہم سو پور جا رہے ہیں۔“

”سو پور؟“ ایک نے پوچھا ”سو پور تو پیچھے رہ گیا ہے۔ تم شمالی علاقے کی طرف چلے آئے ہو۔“

دوسرے نے کہا ”تمہیں جنوب کی طرف واپس جانا ہوگا۔ تھوڑی دیر میں شام کا اندھیرا پھیلنے والا ہے۔ اپنی لہ والی کے ساتھ کہاں بھٹکتے پھرو گے؟ میرے ساتھ چلو۔“

وہ اس کے پیچھے جانے لگے۔ پیش امام نے اس شخص سے کہا ”دین محمد مہمانوں سے صحیح تعارف حاصل کر لینا۔ ہم انتظار کریں گے۔“

دین محمد انہیں اپنے گھر لے آیا۔ ایک بڑا سا مکان تھا۔ اس کے بیوی بچے تھے۔ بیوی شاداں کو اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گئی۔ دین محمد نے بیٹھک میں آکر کہا ”یہاں آرام سے بیٹھو۔ بھوکے پیاسے ہو گے۔ سفر کی تھکن بھی ہوگی۔ فکر نہ کرو۔ یہاں کھانا پانی اور بستر سبھی ملے گا مگر پہلے ضروری بات بتا دو۔ ہم سے کچھ نہ چھپاؤ۔ یہاں دوسرے مذہب اور قوم کے لوگ بھی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کبھی کوئی مجاہد بھٹک کر ادھر آ جاتا ہے تو ہم اسے پناہ دیتے ہیں۔ تمہارے ساتھ ایک عورت ہے۔ تم مجاہد نہیں ہو سکتے۔ تم کون ہو؟ ہم سے کچھ نہ چھپانا۔“

”میں مجاہد ہوں۔ منگور کے قریب میں نے شاداں کو دیکھا۔ ایک بد معاش اسے تنگ کر رہا تھا۔ اسے جبراً ایک ریست ہاؤس میں بھارتی افسر کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے فائرنگ کی تو وہ بھاگ گیا۔ میں اسے منگور تک چھوڑنے نہیں جاسکتا تھا اور وہ خود جانا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے فوجی جگہ جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں راستہ بھٹک کر یہاں آ گیا ہوں۔“

”ہوں۔“ دین محمد سر جھکا کر سوچنے لگا پھر بولا ”منہ ہاتھ دھولو۔ میں کھانا گرم کراتا ہوں۔ یہ سامنے غسل خانہ ہے۔“ وہ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ دین محمد نے اپنی شریک حیات کو بلا کر کہا ”انہیں روٹی کھلاؤ۔ میں ابھی آرہا ہوں۔“

وہ باہر چلا گیا۔ میزبان خاتون نے ان کے لیے دسترخوان بچھایا۔ گھر میں جو کچھ پکا تھا ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ وہ بھوکے پیاسے تھے۔ کھانے لگے۔ دین محمد نے واپس آکر کہا۔



”کھانے کے بعد بیٹھک میں آجاؤ۔ ہم کچھ ضروری باتیں کریں گے۔“

وہ کھانے کے بعد بیٹھک میں آیا۔ وہاں پیش امام صاحب تین افراد کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پیش امام صاحب نے پوچھا ”آپ کا نام کیا ہے؟“

”میرا نام کبریا حسن ہے۔ میں اپنے بارے میں اپنے میزبان دین محمد صاحب کو بتا چکا ہوں۔ آپ بھی کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھیں۔ ویسے میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گا۔“

”ہم مہمان کو بوجھ نہیں سمجھتے اور مجاہدین کو تو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ آپ یہاں بے فکری سے رات گزاریں۔ ہم سب نے اپنی بستی کا ایک چکر لگایا ہے اور یہ یقین کیا ہے کہ آپ دونوں کو یہاں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ اچھا ہوا۔ آپ مسجد کی طرف سے آئے تھے۔“

ایک شخص نے کہا ”آپ جب تک یہاں رہیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں کی طرف نہ آئیں جب تک کوئی آپ کو نہیں دیکھے گا۔ آپ یہاں محفوظ رہیں گے۔“

کبریا نے کہا ”ہم آپ کی ہدایات پر عمل کریں گے۔ ہماری آواز بھی کسی کو سنائی نہیں دے گی۔ ہم صبح ہونے سے پہلے چلے جائیں گے۔“

”آپ یہاں جب تک رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں۔ ہم آپ کو بستی والوں سے چھپالیں گے لیکن کبھی کبھی بھارتی فوجی ادھر آتے ہیں۔ وہ زبردستی گھروں میں گھس کر تلاشی لیتے ہیں۔ ہم ایسے وقت مجبور ہو جائیں گے۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔ ہم صبح ہونے سے پہلے چلے جائیں گے۔“

”آپ لوگوں کے پاس اس علاقے کی مناسبت سے گرم کپڑے نہیں ہیں۔ رات ہو چکی ہے۔ باہر برف پڑنے لگی ہے۔ صبح دھوپ نکلنے تک ہر جگہ برف ہی برف دکھائی دے گی۔ دھوپ نہ نکلی تو برف جمتی ہی رہے گی۔“

ایک اور شخص نے کہا ”مجاہدین کبھی کنٹرول لائن پار کر کے ادھر آتے ہیں اور یہیں سے واپس جاتے ہیں۔ کیا آپ بھی واپس جانا چاہتے ہیں؟“

”جی ہاں۔ مجھے آزاد کشمیر پہنچ کر ایک بہت بڑی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔“

”پھر تو آگے سردی بڑھتی جائے گی۔ تمام دن چلتے رہو گے۔ تب کنٹرول لائن تک پہنچو گے۔“

”ہم گرم کپڑے دیں گے۔ کھانے پینے کا سامان دیں

گے لیکن پیش امام صاحب آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“
پیش امام صاحب نے کہا ”آپ میری بات کا برا نہ مانیں۔ لڑکی آپ کے لیے نامحرم ہے۔ آپ کو اس طرح اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔“

کبریا نے سر جھکا لیا۔ دین محمد نے کہا ”میری شریک حیات نے لڑکی سے پوچھا ہے۔ وہ آپ سے نکاح پڑھوانے کے لیے راضی ہے۔ کیا آپ راضی ہیں؟“
”جی ہاں یہ نیک کام ہو جائے تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔“

دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ انہیں رات گزارنے کے لیے ایک کمر دیا گیا اور اب وہ اسی لکڑی سے بنائے گئے مکان کے ایک کمرے میں نیند سے بیدار ہو کر سوچ رہا تھا۔ اپنے موجودہ حالات پر غور کر رہا تھا۔ کمبل کے اندر اس کی دلہن اس سے لیٹے ہوئے گہری نیند سو رہی تھی۔

باہر برف گر رہی تھی۔ سخت سردی تھی۔ دو کمبل اوڑھنے کے باوجود سردی لگ رہی تھی۔ اس نے شاداں کی طرف کروٹ لے کر سرگوشی میں کہا ”شاداں اٹھو۔ پتا نہیں ہم کب سے سو رہے ہیں۔ شاید صبح ہونے والی ہے۔ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔“

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھلی ہوئی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ اس سے اور لگ کر تیسرا کمبل بن گئی۔ سرگوشی میں کہنے لگی ”بڑی سردی ہے۔ تنور سے نہ نکالو۔ کیا جانا ضروری ہے؟“

”ضروری ہے۔ یہاں کسی وقت بھی شکاری کتے آسکتے ہیں۔ ہم اپنے میزبانوں کے لیے مصیبت نہیں بنیں گے۔ چلو اٹھو۔ حوصلہ کرو۔“

وہ الگ ہو گیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر بستر سے اٹھ کر میزبانوں کے دیے ہوئے گرم کپڑے پہننے لگا۔ اس سے کہنے لگا ”تم سو رہی ہو۔ سوتی رہ جاؤ گی۔ میں چلا جاؤں گا۔“

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی ”ننی دلہن کو چھوڑ کر جاؤ گے۔ شرم نہیں آئے گی؟“

”دلہن سردی سے ڈرے گی تو شرم آئے گی۔ کیا میری دلہن ایسی کمزور ہے؟“

وہ بستر سے اٹھ کر گرم کپڑے پہننے لگی۔ اچھے خاصے موٹے اونٹنی کپڑے تھے۔ سر سے لے کر گردن تک ڈھانپنے والی اونٹنی ٹوپیاں تھیں۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ کبریا نے دروازہ کھولا۔ دین محمد نے دھیمی آواز میں کہا ”صبح کے پانچ بجنے والے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد اذان ہوگی۔ کیا آپ

”ہم بالکل تیار ہیں۔ اب یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔“
شاداں میزبان خاتون سے ملنے چلی گئی۔ انہوں نے ایک چری تھیلی دیتے ہوئے کہا ”اس میں خشک میوے ہیں۔ ایک بوتل میں سیب کا مرچہ ہے۔“

دین محمد نے ایک تہ کیا ہوا کاغذ اسے دیتے ہوئے کہا ”میں نے کنٹرول لائن تک پہنچنے کا جو راستہ سمجھایا تھا۔ اس کا نقشہ اس کاغذ میں ہے۔ راستہ بھول جاؤ تو اسے دیکھ لینا۔ راستے میں جو بستیاں آئیں گی ان سب کے نام ترتیب وار لکھے ہوئے ہیں۔“

کبریا نے وہ تہ کیا ہوا کاغذ لے کر لباس کے اندر.... ایک جیب میں رکھ لیا پھر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں ہمیشہ آپ لوگوں کو یاد رکھوں گا۔“

وہ ان سے رخصت ہو کر شاداں کے ساتھ اس گھر سے باہر آیا۔ باہر دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے کبریا سے بیگ لے کر کہا ”آئیے ہم آپ کو بستی کے باہر پہنچا دیں گے۔“

وہ ان کے پیچھے جانے لگے۔ وہ بستی کے باہر ایک لمبا چکر کاٹتے ہوئے اس راستے پر آئے۔ جہاں سے انہیں آگے جانا تھا۔ دور سے اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کبریا نے اپنا بیگ لیتے ہوئے کہا ”اب آپ لوگ زحمت نہ کریں۔ ہم چلے جائیں گے۔ آپ جائیں نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“

وہ دونوں میزبان مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ شاداں نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا ”تم نے سارا سامان رکھ لیا ہے؟ اسلحہ بھی ہے؟“

محمد مجاہد بھٹہ 03045503086

پچھلے دن جہاں آخری تین سپاہیوں سے مقابلہ ہوا تھا۔ ان کی لاش کے پاس سے انہیں اسلحہ ملا تھا۔ کبریا کی ایک شاٹ گن تھی اور دو ریوالور تھے۔ انہیں آسانی سے بیگ میں چھپایا جاسکتا تھا۔ انہوں نے ایک ایک ریوالور اپنے اپنے لباس کے اندر چھپا لیا تھا۔

برف باری کی وجہ سے دھند اتنی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہاتھ تھام کر چل رہے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ انہیں سورج کے طلوع ہونے اور دھوپ نکلنے کا انتظار تھا۔ وہ چلتے چلتے ایک دم سے ٹھنک گئے۔ کسی کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کوئی دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا ”ادھر کوئی نہیں ہے۔ ہمیں غلط اطلاع ملی ہے۔“

دوسری آواز سنائی دی ”یہاں تو ہم اندھے بنے ہوئے ہیں۔ دھند میں کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ دھوپ نکلنے کا انتظار کرو۔ وہ بھی دھوپ نکلنے کے بعد ادھر سے گزریں گے۔“

شاداں اور کبریا نے اپنے لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آواز کی سمت دیکھ رہے تھے۔ نہ آگے بڑھ سکتے تھے۔ نہ پیچھے جاسکتے تھے۔ پتا نہیں وہ دو تھے یا دو سے زیادہ تھے۔ دھند نے ان سب کو ایک دوسرے سے چھپا رکھا تھا۔ دھوپ نکلتی تو سب ایک دوسرے پر ظاہر ہو جاتے۔ پتا نہیں کس سے کس کو جانی نقصان پہنچتا۔ کبریا نے سوچا اگر وہ تعداد میں زیادہ ہوں گے تو دھند کے چھٹے ہی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔ بہتر ہے کہ اسی دھند میں آنکھ پھولی کھیلی جائے۔

وہ شاداں کا ہاتھ تھام کر ایک طرف جانے لگا۔ چند گز کا فاصلہ طے کرتے ہی اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکرنے دونوں کو چونکا دیا۔ کبریا نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس کے جسم سے ٹکراتے ہی گولی چلا دی۔ وہ کراہتے ہوئے گر پڑا۔ کچھ فاصلے سے آواز سنائی دی ”رام بھروسے! کیا ہوا؟ تم نے گولی کیوں چلائی ہے؟“

کبریا نے اس آواز کی سمت ادھر ادھر تین فار کیے۔ وہاں سے چیخ سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ کسی نے بہت دور سے کہا ”معلوم ہوتا ہے۔ وہ ادھر ہیں۔ ہوشیار رہو۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر تیزی سے ایک طرف چلتے جا رہے تھے۔ برف میں پاؤں دھنس رہے تھے۔ چلنے میں دشواری ہو رہی تھی مگر ایک فائدہ تھا کہ ان کے قدموں کی آوازیں نہیں ابھر رہی تھیں۔

وہ دونوں ہانپتے رہے اور چلتے رہے۔ تقدیر مہربان تھی۔ سورج نکلنے کے باوجود دھوپ نہیں نکل رہی تھی پھر بھی سورج کی کچھ حرارت تھی۔ قدموں تلے برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ دھند ویسی ہی تھی۔ البتہ اس حد تک کم ہوئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ آگے دو چار گز کے فاصلے پر نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک شاداں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کا ایک پاؤں گڑھے میں گر گیا تھا۔ وہ ادھر گرنے والی تھی مگر ہاتھ کبریا کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اس سے لپٹ کر ہانپنے لگی۔ کبریا نے کہا ”یوں آگے بڑھتے رہنا خطرناک ہوگا۔ آگے گہری کھائی بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولی ”ہم یہاں ٹھہریں گے تو وہ آجائیں گے۔“

”ہم تقریباً تین کلو میٹر دور نکل آئے ہیں۔ دھند چھٹ جائے گی۔ تب بھی وہ ہمیں نہیں دیکھیں گے۔ وہ ہم سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔“

ایک فٹ کے فاصلے پر درخت نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں اس درخت سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک کھڑے رہے۔ آسمان پر سورج نظر آ رہا تھا۔ بہت ہی نرم اور لطیف سی دھوپ محسوس ہو رہی تھی۔ دور تک نظر آنے لگا تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگے۔ کچھ دور جاتے ہی فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ایک گولی سنسناتے ہوئے آئی پھر ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی۔ کبریا شاداں کو کھینچتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ ریگتے ہوئے بولا ”ان درختوں کے پیچھے چلو۔“

پیچھے بہت دور سے کسی نے چیخ کر کہا ”بچ کر نہیں جاؤ گے۔ ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔“

وہ دونوں ریگتے ہوئے ایک ایک درخت کے پیچھے چلے گئے۔ اس شخص نے پھر چیخ کر کہا ”ہم نے وائرلیس سے خبر بھیج دی ہے۔ تم جہاں جاؤ گے۔ مارے جاؤ گے۔“

کبریا آواز کی سمت پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں کسی درخت کے پیچھے سے کوئی بول رہا تھا مگر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ گولی چلانے کے لیے درخت کے پیچھے سے نکلے، اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر پوری قوت سے پھینکا۔ اس پتھر کے گرنے کی آواز آتے ہی اس نے درخت کے پیچھے سے نکل کر تڑ تڑ دو گولیاں چلائیں۔ کبریا نے ایک گولی چلائی۔ وہ چیخ مار کر اچھلتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

شاداں درخت کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔ اپنے مرد کے لڑنے کے انداز پر فخر کر رہی تھی۔ اس نے گوریلا جنگ کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ وہ ایسے وقت پوری طرح حاضر دماغ رہتا تھا اور بڑی حکمت عملی سے دشمنوں کو ڈانچ دے کر بچ نکلتا تھا۔ وہ درخت کے پیچھے کھڑا ہوا انتظار کرنے لگا۔ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ادھر اور کتنے دشمن ہیں۔

ادھر خاموشی تھی اور وہ خاموشی سے دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ دشمن نہ کمزور ہوتے ہیں نہ نادان ہوتے ہیں۔ وہ بھی تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ طرح طرح کی حکمت عملی سے لڑنا جانتے ہیں۔ وہ خاموش رہ کر اسے دھوکا دے سکتے تھے یا گھنے درختوں کے پیچھے سے چھپ چھپ کر دوسری طرف سے آسکتے تھے۔

وہ ریوالتور کو لباس کے اندر رکھ کر اس درخت پر چڑھنے لگا۔ درخت بہت گھنا تھا۔ وہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ ایک

اونچی شاخ پر پہنچ کر دیکھنے لگا۔ جسے گولی ماری گئی تھی۔ اس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہاں اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہو سکتا تھا۔ وہ صبر و تحمل سے چھپے ہوئے ہوں یا اسے گھیرنے کے لیے دوسری طرف سے آرہے ہوں۔

اسے وہاں سے جلد نکلنا تھا۔ یہ بات پریشان کن تھی کہ وائرلیس کے ذریعے اس کے بارے میں اطلاع پہنچا دی گئی تھی۔ ان کے بہت زیادہ محتاط اور مستعد ہونے سے پہلے کنٹرول لائن کے کسی علاقے تک پہنچنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ دونوں ان ہی اطراف میں پھنس کر رہ جاتے۔

○☆☆○

انہیں اطلاع ملی تھی کہ کبریا اس لڑکی کے ساتھ شمالی علاقے کی طرف آیا ہے۔ وہ ان علاقوں میں کس سمت جائے گا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ جند چونترہ سے سہانی تک اور نہالہ سے کھوئی رٹہ تک سرحدی علاقے ہیں۔ وہ کسی بھی علاقے تک پہنچ کر کنٹرول لائن پار کر سکتا ہے۔

جبار جان فوجی افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ ایک ٹرک میں تھا۔ انہوں نے آگے ایک ٹیمپ سے دو فوجی جیپیں حاصل کیں پھر وہ سب تین حصوں میں تقسیم ہو کر مختلف سمت جانے لگے۔ جبار جان ایک افسر اور چار سپاہیوں کے ساتھ ایک جیپ میں تھا۔ صبح سے مسلسل چلتے رہنے کے باعث وہ ایک بستی کے قریب آئے چار عورتیں کچھ سامان اٹھائے بستی کی طرف جا رہی تھیں۔ فوجی افسر نے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک دوشیزہ کو دیکھا پھر جیپ روکنے کا حکم دیا۔ جیپ کا سپاہی ڈرائیور اپنے افسر کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے جیپ کو ریورس چلا کر ان عورتوں کے سامنے لا کر روک دیا۔

وہ چاروں ٹھٹھک گئیں۔ انہوں نے مسلح فوجیوں کو دیکھا۔ افسر مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ایک عورت نے اس حسینہ کو اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے پوچھا ”کیا بات ہے؟ ہمارا راستہ کیوں روک رہے ہو؟“

افسر نے کہا ”اس کا نام کیا ہے؟“ اس عورت نے کہا ”میرا نام کیوں نہیں پوچھتا؟ میں اس کی ماں ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا ”جوانی میں ماں کا نہیں کسی منجیل کا نام پوچھا جاتا ہے۔“

اس عورت نے تڑخ کر کہا ”اس کا نام بہنا ہے۔ چل اسے پکار میری بہنا۔“ جبار جان نے جیپ سے اترتے ہوئے اس عورت کو

دھکا دیتے ہوئے کہا ”بہت بولتی ہے۔ ایک ہاتھ پڑے گا تو ہمیشہ کے لیے بولنا بھول جائے گی۔“

دوسری عورتیں پتھر اٹھا اٹھا کر جبار جان کو مارنے لگیں۔ کہنے لگیں ”تو نے مائی کو دھکا دیا ہے۔ تیری ہمت کیسے ہوئی۔ تو فوجی ہے تو کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ گولی مارے گا۔ چلا گولی۔“

خصوصی پیشکش: جاسوسی نشتے ایڈیٹر

وہ پتھر اٹھا اٹھا کر مار رہی تھیں۔ دوسرے سپاہیوں نے آکر انہیں روکا۔ افسر نے کہا ”جبار جان ان کے منہ نہ لگے۔ ہم جسے چاہتے ہیں۔ وہ خود آکر ہمارے منہ لگتی ہے۔ گاڑی میں بیٹھ جا۔“

وہ سپاہیوں کے ساتھ گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ جیپ اشارت ہو کر آگے بڑھ گئی۔ افسر نے جبار جان سے کہا ”اس بڑھیا کو دھکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ تو پرانا شکاری ہے۔ اتنا نہیں جانتا۔ چار عورتیں اکٹھی ہوں تو وہاں چارا نہیں ڈالا جاتا۔ الگ ہوں تو اکیلی کو پھانسا جاتا ہے۔“

وہ بولا ”سر غلطی ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے یہ سامنے والی بستی میں رہتی ہیں۔ آپ حکم دیں گے تو میں اس چھوکری کو اٹھالاؤں گا۔“

”ہمیں بستی میں ٹھہرنا نہیں ہے۔ وہاں کچھ کھاپی کر آگے بڑھنا ہے۔“

وہ بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں کے مکھیا نے اپنے لوگوں کے ساتھ آکر ہاتھ جوڑ کر ان کا استقبال کیا۔ افسر نے پوچھا ”ادھر کوئی آیا تھا؟“

مکھیا نے کہا ”یہاں تو مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ دس دن پہلے پاس والی بستی سے ہمارے دو ملنے والے آئے تھے۔ یہاں جل پان کر کے آگے چلے گئے۔“

”اپنی ذات برادری والوں کی بات نہ کرو۔ کوئی مسلمان ادھر آیا تھا؟ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی ہے۔ ہمیں خبر ملی ہے وہ کل ادھر آئے تھے۔“

مکھیا نے ایک نوجوان سے پوچھا ”اے ہریا! کیا ادھر کوئی مسلمان آیا تھا؟“

”نہیں چاچا یہ چھوٹی سی بستی ہے۔ کوئی آیا ہوتا تو ہمیں ضرور دکھائی دیتا۔“

افسر نے سخت لہجے میں کہا ”تم لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے ہو جاتے ہو۔ ہمیں جو رپورٹ ملی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ وہ دونوں یہاں آئے تھے۔ تمام رات رہ کر صبح سویرے گئے ہیں۔ یہاں سے ایک کلو میٹر آگے ہماری پٹرولنگ پولیس نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ گری دھند میں چھپ

کر کہیں چلے گئے ہیں۔“

مکھیا نے اپنے لوگوں سے کہا ”یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ ہمارے فوجی ایک ایک بات کی پہلی خبر رکھتے ہیں۔ وہ ہماری بستی میں آئے اور ہم بے خبر رہے۔ بڑے شرم کی بات ہے۔“

ایک شخص نے کہا ”وہ مسجد کی طرف سے آئے ہوں گے۔ وہیں کسی کے مکان میں چھپ کر رہے ہوں گے۔ ہم کبھی کبھی ادھر جاتے ہیں۔ کل ادھر نہیں گئے تھے۔“ افسر نے مکھیا سے کہا ”ہمیں ادھر لے چلو۔“

چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ وہ جیپ کو وہاں چھوڑ کر پیدل چلتے ہوئے مسجد کے پاس آئے دو چار مسلمان اپنے لمحوں سے نکل کر انہیں دیکھنے لگے۔ دین محمد بھی آگیا۔ وہ فوجیوں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کوئی گڑبڑ ہے۔ مکھیا نے اس سے کہا ”دینا! کل ہماری بستی میں کون آیا تھا؟ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی تھی۔ دیکھ جھوٹ نہ بولنا۔ ہمارے فوجی پکی خبر رکھتے ہیں۔“

دین محمد نے کہا ”یہ چھوٹی سی بستی ہے۔ کوئی ایک گھر میں کھائے تو پوری بستی والوں کو آواز سنائی دیتی ہے اگر کوئی کسی لڑکی کے ساتھ آئے گا تو یہاں کسی سے چھپ کر رہ سکے گا۔“

افسر نے دین محمد کو ایک ہاتھ جھماتے ہوئے کہا ”جتنا پوچھا جائے اتنا ہی بولو۔ وہ دونوں یہاں آئے تھے۔ بولو آئے تھے یا نہیں۔“

اس نے مختصر سا جواب دیا ”نہیں۔“ افسر نے پھر اسے ایک ہاتھ مارا۔ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”مارتے کیوں ہو؟ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو بستی کے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ لو۔ یہ مکھیا ہے۔ اس بستی کا ذمے دار شخص ہے۔ اسے بھی مارو۔ اس نے بھی یہاں کسی کو نہیں دیکھا ہے۔“

مکھیا نے کہا ”اے دینا! کو اس نہ کر۔ یہاں تمہارے دس بارہ مکانات ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ کوئی رات کو چھپ کر آئے اور صبح چلا جائے تو ہمیں کیسے خبر ہوگی۔“

افسر نے کہا ”مکھیا ٹھیک کہتا ہے۔ یہاں آس پاس تم مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ادھر پہلے بھی آتنگ وادی آئے ہوں گے مگر کل جو آئے تھے ان سے بھید کھل گیا ہے۔“

پیش امام صاحب نے آکر کہا ”بھید کھل گیا ہے تو وہ پکڑے گئے ہوں گے۔ کیا ان گرفتار ہونے والوں نے ہمارے خلاف کوئی بیان دیا ہے؟“

”وہ پکڑے نہیں گئے مگر انہوں نے اس بستی سے آگے جا کر پٹرولنگ پولیس کے دو سپاہیوں کو ہلاک کیا ہے۔ آگے نہیں چلے گئے ہیں۔ جب پکڑے جائیں گے تو انہیں پناہ دینے کے جرم میں تم لوگوں کی بھی شامت آئے گی۔ جس نے بھی اپنے گھر میں انہیں پناہ دی ہوگی۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔“

خصوصی پبلکنٹ: جاسوسی نشتہ ایڈمنٹر

”قانون آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بندوق آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں مگر آپ پہلے انہیں گرفتار تو کریں۔ ان سے بیان لیں۔ ان کا بیان ہمارے خلاف ہو گا تو بے شک ہمیں جو چاہیں سزا دیں۔ خدا کے لیے ابھی تو ظلم نہ کریں۔“

افسر نے جبار جان اور سپاہیوں سے کہا ”یہاں جتنے مسلمان ہیں۔ ان کے گھروں میں جاؤ اور تلاشی لو۔ پچھلی رات ان کی موجودگی کا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ملے گا۔“ وہ انہیں گھروں میں گھسنے اور تلاشی لینے سے نہیں روک سکتے تھے۔ وہ سب اپنی عورتوں اور بچوں کو گھروں سے باہر لے آئے۔ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ جبار جان اور چار سپاہی مختلف گھروں میں گھس کر تلاشی لینے لگے۔ کھانے افسر سے کہا ”یہ کام دو سپاہیوں کا ہے۔ آپ میرے گھر چلیں۔ جل پان کریں۔“

افسر نے کہا ”میرے سپاہیوں کے لیے بھی کھانے کا انتظام کرو۔ ہمیں یہاں سے فوراً آگے جانا ہے۔“ کھانا کھانے کا انتظام کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو حکم دینا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت کتنی ہی عورتیں وہاں آگئیں۔ ان میں وہ مائی بھی تھی۔ جسے جبار جان نے دھکا دیا تھا۔ مائی نے افسر کو دیکھ کر کہا ”ہمیں معلوم تھا تو یہاں آئے گا۔ وہ مجھے ہاتھ لگانے والا اور دھکا دینے والا کہاں ہے؟ ہاتھ میں بندوق لے کر سو رہا ہے۔ ماں کا دودھ پیا ہے تو اب ہاتھ لگاؤ۔“

کھانا نے اس کے اور افسر کے درمیان آکر کہا ”مائی تجھے کیا ہوا ہے۔ افسر بابو سے یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔“ وہ بولی ”کھانا! یہ افسر بابو تیری بیٹی پر نیت خراب کر رہا تھا۔ میں اسے باتیں سنانے لگی تو اس کا ایک آدمی مجھے مارنا چاہتا تھا۔ پوچھ لے اس سے۔“

کھانا کے تیور بدل گئے۔ اس نے غصے سے افسر کو دیکھا پھر کہا ”کیا آپ کو بد معاشی کے لیے میری بیٹی نظر آئی تھی؟ ہم اپنے دیس کی سینا کے ہر سپاہی کی عزت کرتے ہیں۔ وہ ہماری بستی میں آتے ہیں۔ ہم انہیں ملن دیتے ہیں اور آپ ہمارا

مان توڑ رہے ہیں۔“

افسر نے کہا ”غصے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہاری چھو کری کو ابھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میرے آدمی نے تجھے ہاتھ لگایا تو کیا ہوا تو تو بوڑھی ہو چکی ہے۔“ ایک عورت نے کہا ”بوڑھی ہو یا جوان۔ اگلی بار کسی کو میلی نظر سے مت دیکھنا۔“

افسر نے اس کی طرف تھوک کر کہا ”سالی دو کوڑی کی عورت مجھ پر حکم چلا رہی ہے۔ اے کھیا عورتوں کی یہ پلٹن یہاں سے لے جا۔ میرا ماتھا گھوم گیا تو تیری چھو کری کو اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

کھیا نے کہا ”ایک باپ سے ایسی بے شرمی کی باتیں نہ کرو۔ کیا ہماری بہن بیٹیاں لوٹ کا مال ہیں؟ بھگوان کے لیے اپنا کام جلدی کرو اور یہاں سے جاؤ۔“

”ہاں جانا تو ہو گا۔ ڈیوٹی سے مجبور ہوں۔ اس آتنگ وادی کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنا ہے۔ پر ایک بات کہہ دیتا ہوں۔ تیری چھو کری پر دل آگیا ہے۔ واپس ضرور آؤں گا۔“ کھیا غصے سے پاؤں پٹختا ہوا ذرا دور گیا۔ پیش امام صاحب نے پوچھا ”کیا ہوا کھیا؟ اپنے پاؤں میں کاٹنا چھ رہا ہے۔ جس شاخ پر آشیانہ تھا۔ وہی شاخ ٹوٹ رہی ہے؟“ جبار جان سپاہیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا اور کہہ رہا تھا ”وہ بہت چالاک تھے۔ اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑ کر نہیں گئے ہیں۔“

مائی نے ایک پتھر اٹھایا۔ کئی عورتوں نے بھی پتھر اٹھالے۔ وہ جبار جان سے بولی ”مرد کا بچہ ہے تو آ۔ مجھے ہاتھ لگا۔ ہم نے پاکستان کے ٹی وی میں مسلمان عورتوں کا جلوس دیکھا ہے۔ ہم ہندو عورتیں بھی جلوس نکالیں گی۔ آج معلوم ہو گیا۔ کتوں کو ہندو اور مسلمان نظر نہیں آتے۔ وہ تو کسی کو بھی کاٹ لیتے ہیں۔“

افسر نے تبھی کے ہاتھ میں پتھر دیکھے تو ریوالبور نکال کر ایک ہوائی فائر کیا۔ تمام عورتیں سہم کر پیچھے چلی گئیں۔ مرد بھی سہم گئے۔ تمام سپاہیوں نے بندوقیں تان لی تھیں۔ افسر نے سپاہیوں سے کہا ”چلو یہاں سے“ اگر کوئی پتھر مارے تو اسے گولی مار دینا۔ کوئی ہمارے پیچھے نہ آئے۔“

وہ غصے سے گرج رہا تھا پھر اس نے مائی سے کہا ”تو نے ہمیں کتا کہا ہے۔ تو میں کتا بن کر ہی دکھاؤں گا۔“

وہ غصے سے جانے لگا۔ جبار جان اور سپاہی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ جب وہ ایک گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو دین محمد نے کھیا سے کہا ”وہ مجھے مار رہا تھا اور

تم ہمارے کھیا ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے۔“
کھیا نے کہا ”اور کیا کرتا۔ کیا اس افسر سے لڑ پڑتا؟
ہماری اوقات کیا ہے؟“

”اوقات بنانے سے بنتی ہے۔ جب اپنی بیٹی پر بات آئی
تو تم لڑنے کے انداز میں بولنے لگے تھے۔ صرف اپنا درد کیوں
محسوس ہوتا ہے۔ دوسروں کا کیوں نہیں ہوتا۔ اس بستی میں
ہم گنتی کے لوگ ہیں۔ کیا ہم آپس میں ایک ہو کر نہیں رہ
سکتے؟“

”تم لوگوں سے ایسا نہیں ہو گا۔ تم لوگ دیس دروہی ہو۔
غلام کشمیر سے آنے والے آتنگ وادیوں کو اپنے گھروں میں
چھپاتے ہو۔“

دین محمد نے پوچھا ”وہ فوجی افسر تمہاری بیٹی کو اٹھالے
جانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا وہ دیس دروہی نہیں ہے؟“
پیش امام صاحب نے کہا ”ہم تمام مسلمانوں نے
تمہاری بیٹیوں اور بہنوں کو ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھا ہے۔ جو
ایسا نہیں سمجھتا وہ تمہارا دشمن ہے۔ تعجب ہے کہ دوستوں کو
دشمن اور دشمن کو دوست سمجھتے آرہے ہو۔“

کھیا کے پیچھے کھڑے ہوئے جوان نے سینہ تان کر کہا۔
”ہم دشمن بننے والے دوستوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔ اپنی سینا
کی عزت کرتے ہیں مگر اس کا کوئی سپاہی ہماری عزت پر ہاتھ
ڈالے گا تو ہم اس سے بھی نہیں ڈریں گے۔“

کھیا نے کہا ”ہم بزدل نہیں ہیں۔ ہماری عورتیں پھراٹھا
سکتی ہیں تو ہم ہتھیار اٹھا سکتے ہیں۔“
اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ چیخ
چیخ کر کہنے لگا ”کھیا وہ تیری بیٹی کو لے گئے ہیں۔ تیری بیٹی
میرے گھر آرہی تھی۔ انہوں نے اسے روک لیا۔ زبردستی
اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

یہ سنتے ہی سب لوگ دوڑتے ہوئے ادھر جانے لگے۔
کھیا کا سر چکر اگیا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ پیش امام نے کہا
”بہت برا ہوا ہے۔ جس کے ہاتھ میں بندوق ہوتی ہے۔ وہ
طاقت کے نشے میں ہندو اور مسلمان کو نہیں دیکھتا۔ طیش میں
آکر اپنی ضد پوری کرتا ہے۔“

اس بستی کے تمام مرد، عورتیں، بچے، دوڑتے ہوئے
بستی کے باہر تک گئے تھے لیکن وہ فوجی جیب کہیں نظر نہیں
آئی۔ کتے کو کتا کہو تو وہ برا نہیں مانتا۔ آدمی کو کہو تو وہ کتا بن کر
ضرور کاٹتا ہے۔ ایسے کتوں کو گولی نہیں ماری جاتی۔ سینے پر
تمغے سجائے جاتے ہیں۔

○☆☆○

ڈب گاؤں میں خیمہ بستیاں ہیں۔ یہ آزاد کشمیر میں
ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے سرحدی علاقوں سے اکثر متاثرہ
خاندان آتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے ایسے خیمے لگائے جاتے
ہیں۔ ان خیموں میں بوڑھی عورتیں، مرد اور بچے ہوتے
ہیں۔ جوان لڑکیاں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے
کتنے ہی خاندان جوان بیٹیوں کی بے آبروئی کے تماشے دیکھ کر
ان کی ہلاکت کے صدمے اٹھا کر سرحد پار کر کے آتے ہیں۔

ان خیمہ بستیوں میں جوان بھائی اور بیٹے بھی دکھائی
نہیں دیتے۔ وہ بھی سرحد کے اس پار شہید ہو چکے ہوتے
ہیں۔ ایسی خیمہ بستیاں سرحدی علاقوں میں جگہ جگہ ہیں۔ وہ
قسمت کے مارے وہاں بھی سکون سے رہ نہیں پاتے ہیں۔
سرحد پار سے گولیاں چلتی ہیں۔ گولے پھینکے جاتے ہیں۔ اس
کے باوجود وہ وہاں زندگی گزار رہے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں
اور کہیں نہیں جاسکتے۔ وہاں ہریالی ہے۔ پھول کھلتے ہیں۔
بچوں کے چہرے نہیں کھلتے۔ وہ معصوم بچے چپ چپ سے
رہتے ہیں۔ پرانی شکستہ راکٹوں اور کارتوس کے خول سے
کھیلے رہتے ہیں۔ بوڑھے مویشی پالتے ہیں۔ لکڑیاں کاٹتے
ہیں۔ امدادی تنظیمیں محدود راشن سپلائی کرتی ہیں۔

ادھر مجاہدین آتے ہیں۔ دشمنوں پر جوابی حملے کرتے
ہیں۔ ان سرحدی علاقوں کی عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے
سب ہی ایسے جیتے ہیں جیسے اگلے بل شہید ہو جانا ہے۔ وہ
سمجھتے ہیں کہ موت برحق ہے۔ آج نہیں تو کل مرنا ہی ہے تو
پھر جہاد کرتے ہوئے موت کو گلے کیوں نہ لگایا جائے۔ وہ
آزادی کی خاطر دیوانوں کی طرح جیتے اور مرتے ہیں۔ انہیں
اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اقوام متحدہ کا فیصلہ کیا ہو گا۔
عالمی میڈیا ان کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ دنیا والے
ان کی آزادی اور جدوجہد کو اہمیت دیتے ہیں یا نہیں؟ انہیں
ایسی باتوں کی پروا نہیں ہے۔ ان کا ایک ہی ایمان ہے۔ ایک
ہی عزم ہے کہ جہاد جاری رہے گا۔ یہ جنت ارضی ہماری
ہے۔ یہ جنت زندگی میں بھی ہماری ہے اور شہادت کے بعد
بھی ہماری رہے گی۔

○☆☆○

ایک معمر خاتون ایک امدادی تنظیم کی گاڑی میں بیٹھ کر
جگہ جگہ سرحدی علاقوں میں جا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ
تنظیم کے ارکان، صحافی اور فوٹو گرافر بھی تھے۔ وہ خیمہ بستی
میں امدادی سامان تقسیم کر رہے تھے۔ صحافی اور فوٹو گرافر
وہاں کے چشم دید حالات لکھ رہے تھے اور تصویریں اتار
رہے تھے اور وہ معمر خاتون اپنے اکلوتے جوان بیٹے کبریا حسن

کو تلاش کر رہی تھیں۔ استعمال سے چوبیس گھنٹوں تک وہ دماغی تکلیف سے محفوظ رہے گا۔

باپ نے اسے اتنی دوائیں خرید کر دیں، جنہیں وہ چار ماہ تک استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے سفری بیگ میں وہ تمام دوائیں رکھ لیں پھر ماں کے گلے لگ کر باپ سے رخصت ہو کر وہاں آگیا۔ مجاہدین کی ایک تنظیم سے رابطہ کیا۔ وہ تربیت یافتہ تھا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ابتدا میں اسے چھوٹے چھوٹے معرکوں میں حصہ لینے کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے بہترین ذہانت اور حکمت عملی کا ثبوت دیا۔ تب اسے چند مجاہدین کے ساتھ کنٹرول لائن کے پار لایا گیا۔ جب کوئی مجاہد لائن آف کنٹرول کو پار کر کے مقبوضہ کشمیر میں پہنچ جاتا ہے تو مجاہدین کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ وہ میدان جنگ میں لایا ہو چکا ہے۔

کبریا سے کہا گیا تھا کہ وہ چار ماہ کی دوائیں نہ لے۔ ایسی مہم میں کم سے کم ضروری سامان رکھنا چاہیے۔ وہ بیس بائیس دن کے لیے جا رہا ہے۔ اس مدت میں اسے واپس آ جانا چاہیے اور اسے زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کی دوائیں اپنے پاس رکھنا چاہیے۔

میدان جنگ میں خوراک کم اور گولے زیادہ رکھے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے بیگ میں ڈیڑھ ماہ کی دوائیں رکھیں۔ باقی دوائیں تنظیم کے دفتر میں چھوڑ دیں۔ وہ ماں تنظیم کے دفتر میں آئی تھی۔ ان دواؤں کو وہاں دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے کہا ”میں اپنے ساتھ بھی کچھ دوائیں لائی ہوں لیکن وہ یہ دوائیں بھی یہاں چھوڑ گیا ہے۔ آپ لوگوں نے یہ دوائیں اس کے پاس کیوں نہیں پہنچائیں؟“

مجاہدین کے ایک ٹرینر نے کہا ”آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ اپنے ساتھ ڈیڑھ ماہ کی دوائیں لے گیا ہے پھر یہ کہ مقبوضہ کشمیر کے شہروں میں ایسی دوائیں مل جاتی ہیں۔“

”مگر وہ کہاں ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ بائیس دن کے لیے گیا تھا لیکن ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ وہ واپس کیوں نہیں آیا؟ آپ اس کی خبر کیوں نہیں لیتے؟“

”ہم اس کے لیے فکر مند ہیں۔ وہ جن مجاہدین کے ساتھ گیا تھا۔ وہ سب بائیس دن سے پہلے ہی اپنے فرائض بخوبی انجام دے کر واپس آ گئے ہیں۔ آپ کے بیٹے نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے بعد ہم کارگل کے محاذ پر جلد ہی کامیابی حاصل کریں گے۔ آپ کو فخر کرنا چاہیے۔“

”فخر تو ساری مائیں کریں گی۔ ساری قوم گرے گی مگر میرا بیٹا کہاں ہے؟“

کبریا کے والد ایک ریٹائرڈ فوجی سپاہی تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بیٹے کو پاکستان آرمی کا بہت بڑا افسر بنائیں گے۔ بڑا افسر بنانے کے لیے انہوں نے کبریا کو تعلیم دلائی۔ وہ کیڈٹ کالج اور ٹریننگ سینٹر میں رہا۔ ذہنی اور جسمانی محنت و مشقت سے اور سچی لگن سے ہر امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرتا رہا لیکن آخری مرحلے میں وہ اور اس کے والدین مایوس ہو گئے۔

ٹریننگ سینٹر میں جب آخری بار اس کا میڈیکل چیک آپ ہوا تو توقع کے خلاف رپورٹ نیگیٹو نکلی۔ وہ برین کینسر کے پہلے اسٹیج پر تھا۔

ایک ہی جوان بیٹا تھا اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ ماں اپنے بچوں کو دھوپ سے بھی بچاتی ہے۔ بیٹے پر موت کی آنچ آرہی تھی۔ دھوپ سے بچانے والی ماں اس آنچ سے نہیں بچا سکتی تھی۔ جوان بیٹے کو دیکھ دیکھ کر روتی رہتی تھی۔ باپ نے کہا ”رونے سے زندگی نہیں ملتی۔ ہمیں اپنے نصیبوں پر ہنسنا چاہیے۔ صبر کرو۔“

وہ روتے ہوئے بولی ”صبر نہیں ہوتا۔“

”دعا کرو۔ دعا پر اعتماد نہیں رہا۔ کاتب تقدیر نے موت کے پروانے پر مہر لگا دی تھی۔ دعا کے پر جلا دیے تھے۔ وہ عرش تک پرواز نہیں کر سکتی تھی۔“

کبریا نے کہا ”اماں! نسو پونچھ لو۔ میں یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خاموشی سے نہیں مروں گا۔ جو موت مجھے چیلنج کر رہی ہے۔ میں اس موت کو چیلنج کروں گا۔ ایک بڑے مقصد کے لیے جہاد کروں گا۔ اس سے پہلے کہ کینسر سے موت آئے۔ میں شہادت حاصل کروں گا۔ کینسر کو ٹھینکا دکھا کر اس دنیا سے جاؤں گا۔“

ماں نے کہا ”میں تجھے کہیں جانے نہیں دوں گی۔ تجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھوں گی۔“

باپ نے کہا ”بیٹے کو دیکھتی رہے گی۔ روتی رہے گی اور مرتی رہے گی۔ بیٹا بھی کسی مقصد کے بغیر بزدلوں کی طرح بیماری سے مار کھاتے کھاتے مرجائے گا۔ میں سپاہی ہوں۔ اپنے بیٹے کو مار کھانے والا سپاہی نہیں بناؤں گا۔ اسے جانے دے۔“

ڈاکٹر نے اسے دوائیں دی تھیں۔ تاکید کی تھی کہ وہ انہیں روزانہ مقررہ وقت پر استعمال کرے۔ ان کے علاوہ ایک گولی اور ایک کیپسول کے لیے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ دورہ پڑنے کے بعد انہیں استعمال کیا جائے۔ ان کے

”وہ ایک معرکے میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ بعد میں جو مجاہدین گئے ہیں، وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران میں اسے تلاش کریں گے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اس کی خیریت معلوم ہو سکے گی۔“

”آپ مجھے تسلیاں دے رہے ہیں۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر بیمار بیٹے کو جہاد کے لیے بھیجا ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر کوئی بری خبر بھی سن لوں گی۔ مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیں۔“

”آپ یقین کریں۔ ہم آپ سے کچھ نہیں چھپا رہے ہیں۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ آپ نہیں جانتیں ایسے کتنے سر پھرے جوان ہیں جو گھر بیٹھے بیماری سے لڑنے کے بجائے میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑ رہے ہیں ان میں سے کچھ غازی بن کر واپس آتے ہیں۔ کچھ شہید ہو جاتے ہیں۔ ان شہیدوں کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں گم ہو گئے ہیں۔ جب آپ کے بیٹے کا پتا چلے گا تو آپ کو بتا دیا جائے گا۔ ہم آپ سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔ دو مجاہدین کل یہاں واپس آنے والے ہیں۔ ان سے کوئی خبر مل سکتی ہے۔“

”میں یہاں رہوں گی۔ اس کا انتظار کروں گی۔ آپ سرحدی علاقوں کی طرف جا رہے ہیں۔ میں بھی چلوں گی۔ وہاں کی خیمہ بستیوں میں زخمی بھی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میرا کبریا وہاں زخمی حالت میں ہو۔“

”مجاہدین زخمی حالت میں آتے ہیں تو ہمیں اطلاع مل جاتی ہے۔ آپ کا بیٹا خیمہ بستی میں نہیں ہو گا پھر بھی اپنی سسلی کے لیے آپ ہمارے ساتھ چل سکتی ہیں۔“

وہ ماں تنظیم کے ارکان کے ساتھ مختلف خیمہ بستیوں کی طرف جا رہی تھی۔ متا بھری ویران آنکھوں سے اسے تلاش کر رہی تھی۔ کہاں ہو بیٹا؟ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ تم بیک وقت دو محاذوں پر کیسے لڑ رہے ہو۔ دشمنوں سے بھی بیماری سے بھی، کس محاذ پر جیتو گے؟ کس محاذ پر ہارو گے؟

اس ماں کو ایک بزرگ نے سمجھایا تھا ”اللہ تعالیٰ رحمن ہے، رحیم ہے، کریم ہے۔ اس کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹے کے لیے دعائیں کرتی رہو۔ وہ رب کریم اپنے فیصلے بدلتا ہے۔ آنے والی موت کا رخ بدل دیتا ہے۔“

وہ ماں دن رات دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ پتا نہیں کتنی مائیں اپنے بیمار مجاہدین کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوں گی۔ وہ جان پر کھیلنے والے کب اور کہاں جان دے دیتے ہیں؟ دشمنوں سے لڑتے ہوئے مارے جاتے ہیں یا بیماری انہیں مار ڈالتی ہے۔ جہاد کے دوران میں وہ ہر حال میں شہید ہوتے ہیں

مگر ان کی لاشیں نہیں ملتیں۔ وہ بے گورو کفن رہ جاتے ہیں۔ کبریا اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا پھر اسے تنہا کنٹرول لائن کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کبھی دشمن گھیر لیتے تھے۔ کبھی وہ راستے سے بھٹک جاتا تھا۔ یوں بھٹکنے کے دوران میں اسے شاداں کا پار ملا اور ایک اہم ویڈیو کیسٹ ملی۔ جس کو اپنی تنظیم کے دفتری طرف پہنچانا لازمی تھا۔

وہ گھنے درخت سے اتر کر نیچے آگیا۔ شاداں سے بولا۔ ”دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا ہے معلوم ہوتا ہے وہی ایک دشمن تھا۔ جو وہاں مردہ پڑا ہے۔ ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔“

اس نے اپنے لباس کے اندر سے ایک تہ کیا ہوا کانڈ نکالا۔ دین محمد نے اس کانڈ پر کنٹرول لائن تک پہنچنے کا نقشہ بنایا تھا۔ وہ اسے کھول کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کہنے لگا ”اس نقشے میں دو چھوٹی بستیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد چھ کلو میٹر دور کنٹرول لائن ہے۔“

شاداں نے کہا ”ہم صبح سے چل رہے ہیں۔ راستے میں کوئی بستی نہیں آئی۔“

کبریا نے کہا ”کئی گھنٹوں تک دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے ہم ایک بستی کے قریب سے گزرے ہوں۔ ہمیں تو قریب کی چیزیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔“

وہ آگے بڑھتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ خشک میوے نکال کر کھانے لگے۔ شاداں نے اس کے ساتھ لگ کر چلتے ہوئے کہا ”آگے پیچھے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ سفر کٹھن ہے مگر میں تمہارے ساتھ تمام عمر یونہی چلتی رہوں گی۔“

کبریا ان لمحات میں اپنے بوڑھے والدین کو یاد کر رہا تھا۔ ماں کی آنسو بھری آنکھیں اور متا بھرا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ شاداں نے پوچھا ”پپ کیوں ہو؟ کچھ سوچ رہے ہو؟“

وہ بولا ”اماں کا دل بہت کمزور ہے۔ ویسے تو وہ بڑی ہمت والی ہیں مگر میری محبت انہیں کمزور بنا دیتی ہے۔ میں نے ایک ماہ پہلے انہیں خط لکھا تھا۔ اپنی خیریت سے آگاہ کیا تھا اور لکھا تھا کہ اب پچیس دنوں کے بعد خط لکھوں گا۔ وہ تنظیم کے پتے پر مجھے خط لکھ سکتی ہیں۔“

”پھر تو انہوں نے خط لکھا ہو گا۔ جواب کا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”اماں کتنے ہی خط لکھ چکی ہوں گی۔ میں نے پچیس دن کہا تھا۔ اب ایک مہینے گزر گیا ہے وہ بہت پریشان ہوں گی۔ میں وہاں جاتے ہی انہیں خط لکھوں گا۔“

”خط کیوں لکھو گے۔ بہو کو ان کے پاس نہیں لے جاؤ

گے۔

”میں میدان چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ پتا نہیں کتنی سانسیں رہ گئی ہیں۔ میں پھر جہاد کے لیے واپس آؤں گا۔ اماں کو وہاں بلا کر تمہیں ان کے سپرد کروں گا۔“

”مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ یہاں پھر واپس آؤ گے تو میں بھی آؤں گی۔ تمہیں میری ضرورت ہو یا نہ ہو۔ تمہاری بیماری کو میری ضرورت ہے۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ تم ساتھ رہو گی تو کیا بیماری بھاگ جائے گی؟“

محمد مجاہد 03045503086

”میں ایک مجاہد کو تنہا چھوڑ سکتی ہوں۔ ایک بیمار کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑوں گی۔“

”اچھا بحث نہ کرو۔ آئندہ کیا ہوگا، یہ کوئی نہیں جانتا۔ ابھی دشمن ہمارے تعاقب میں ہیں آگے بھی انہیں اطلاع مل چکی ہے اور ایک دشمن بیماری میرے اندر ہے۔ کنٹرول لائن پار کرنے سے پہلے ہی کسی نہ کسی سے مات ہو سکتی ہے۔“

اور شاید مات ہونے والی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر دو بڑے پتھروں کے پیچھے دو آدمی رائفلیں۔۔۔ تان کر کھڑے ہوئے تھے۔ کبریا انہیں دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ پتھروں کے پیچھے تھے۔ اس کی فائرنگ سے بچ سکتے تھے لیکن وہ شاداں کے ساتھ کھلی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ بری طرح پھنس گیا تھا۔

وہ ادھر ادھر دوڑتا بھاگتا ہوا۔۔۔ شاید خود کو فائرنگ سے بچا سکتا تھا لیکن شاداں نہیں جانتی تھی کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ وہ بے موت ماری جاتی۔ وہ دونوں رائفل بردار وردی میں نہیں تھے۔ فوجی سپاہی نہیں ہو سکتے تھے لیکن فوج کے مجبوروں کے پاس بھی ہتھیار رہا کرتے تھے۔ جبار جان بھی اسی طرح ہتھیار لیے انہیں تلاش کر رہا تھا۔

ایک نے پتھر کے پیچھے سے گرجتے ہوئے پوچھا ”تم کون ہو؟ اس عورت کے ساتھ کہاں جا رہے ہو؟“

کبریا نے کہا ”یہ میری گھر والی ہے۔ ہم پاس والی بستی کھینڑہ کے رہنے والے ہیں۔“

دوسرے نے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

کبریا نے کہا ”میرا نام دین محمد ہے۔ ہم کوئی آئنگ وادی نہیں ہیں۔“

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا ”آئنگ وادی نہیں ہو مگر دونوں کے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں۔“

”ہم نے دشمنوں سے بچنے کے لیے ہتھیار رکھے ہیں۔“

کبریا نے زیر لب کہا ”شاداں میں تمہارے آگے ڈھال بن رہا ہوں۔ جیسے ہی گولی چلاؤں تم زمین پر گر کر لڑھکتے ہوئے درخت کے پیچھے چلی جانا۔“

وہ فوراً ہی اس کے آگے آکر بولی ”تم کیوں ڈھال بن رہے ہو؟ مجھے بچانے کے لیے گولی کھاؤ گے؟ مجھے خود غرض اور بے وفا سمجھتے ہو؟“

وہ بولا ”یہ کیا حرکت ہے؟ سامنے سے ہٹو۔ وہ کسی وقت بھی گولی چلا سکتے ہیں۔“

”نہیں ہٹوں گی۔ تم میرے لیے ڈھال بن کر دشمنوں سے لڑ سکتے ہو۔ کیا میں نہیں لڑ سکتی؟“

یہ کہتے ہی اس نے پلٹ کر ان دشمنوں کی طرف گولی چلائی۔ کبریا فوراً ہی ایک فائر کرتے ہوئے شاداں سے پلٹ کر زمین پر گرتے ہوئے لڑھکتے ہوئے ایک درخت کی طرف جانے لگا۔ وہ دونوں انہیں دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ جب وہ درخت کے پیچھے چلے گئے تو ایک نے کہا ”تم دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہو۔ ہم کیا تمہیں ماریں گے؟ مارنا ہوتا تو گولی چلاتے۔“

دوسرے نے کہا ”ہم نے ایک بھی گولی نہیں چلائی ہے۔ ہم سامنے آرہے ہیں۔ ہم بھی محبت کرنے والوں میں سے ہیں۔ ہم پر گولی نہ چلانا۔“

وہ دونوں پتھروں کے پیچھے سے نکل کر کھلی جگہ آگئے۔ ایک نے کہا ”تمہارے ایک جھوٹ کے پیچھے سچ سمجھ میں آگیا ہے۔ تم کھینڑہ بستی کے رہنے والے نہیں ہو۔ اس بستی میں کوئی مسلمان نہیں ہے تم ہماری طرح مجاہد بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ مجاہدین کے ساتھ عورتیں نہیں ہوتیں۔“

کبریا نے درخت کے پیچھے سے کہا ”میں بھی سامنے آ رہا ہوں۔ تم نے خود کو مجاہدین کہا ہے۔ میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔“

وہ شاداں کے ساتھ درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ ایک نے پوچھا ”کیا تم نے اپنا صحیح نام بتایا ہے؟ کیا تمہارا نام دین محمد ہے؟“

”یہ میرا نام نہیں ہے۔“

”تو پھر تم کبریا حسن ہو۔“

کبریا نے چونک کر پوچھا ”تم کیسے جانتے ہو؟“

دوسرے نے کہا ”تمہیں یہاں بائیس دنوں کے لیے لالچ کیا گیا تھا اور تم ایک ماہ سے لاپتا ہو۔ تمہاری ماں خط پر خط لکھ رہی ہے۔“

کبریا ریو الوور پھینک کر دوڑتا ہوا آکر اس سے پلٹ گیا۔

وہ دونوں اس سے مصافحہ کرنے اور اسے گلے لگانے لگے۔ ایک نے کہا ”میرا نام توقیر احمد ہے۔“ دوسرے نے کہا ”مجھے ربانی کہتے ہیں۔ جب ہم وہاں سے چلے تو تمہاری ماں کا خط آیا ہوا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ تم سے ملنے آرہی ہے۔ ہم تمہارے لیے بڑے فکر مند تھے۔“

محمد مجاہد بھٹہ 03045503086

توقیر نے کہا ”خدا کا شکر ہے۔ تم زندہ سلامت ہو۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم یہاں اپنے فرائض انجام دینے کے دوران میں تمہیں تلاش کرتے رہیں۔“ کبریا نے کہا ”میں دیر سے واپس جا رہا ہوں مگر کامیاب و کامران جا رہا ہوں۔ یہاں سے کنٹرول لائن کتنے فاصلے پر ہے؟“

”یہاں سے کھینڑ بستی دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے پھر وہاں سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر کنٹرول لائن ہے۔ شام ہو رہی ہے ابھی سے برف باری ہونے لگی ہے۔ آدھی رات تک بستی میں رہنا ہو گا پھر تاریکی میں اور گہری دھند میں کنٹرول لائن پار کر سکو گے۔“

ربانی نے پوچھا ”کیا تمہارے پاس سرحدی تار کانٹوں کو کاٹنے والا آلہ ہے؟“ ”نہیں ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح اپنے لوگوں سے رابطہ کروں گا۔ کس طرح کنٹرول لائن عبور کروں گا۔ تم دونوں میری رہنمائی کر سکتے ہو۔“

”فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں ایک پلاس دیں گے۔ تم تار کانٹوں کو کاٹ سکو گے اور شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ ہم وائرلیس کے ذریعے تنظیم کے دفتر سے رابطہ کریں گے۔ تمہارے بارے میں اطلاع دیں گے وہ تمہیں کنٹرول لائن پار کرادیں گے۔“

وہ پتھروں کے پیچھے آئے۔ وہاں توقیر اور ربانی کے سفری بیگ رکھے ہوئے تھے۔ ایک وائرلیس سیٹ بھی تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر اسے آپریٹ کرنے لگے۔ رابطہ ہونے پر توقیر نے اپنا نام بتایا۔ کوڈ ورڈ ادا کیے پھر کہا ”کبریا حسن صحیح سلامت ہے۔ ابھی ہمارے ساتھ ہے۔ یہ آج رات کنٹرول لائن پار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خاتون بھی ہے۔“

دوسری طرف سے پوچھا گیا ”ایک مجاہد کے ساتھ خاتون کہاں سے آگئی۔ یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔ میدانِ ننگ میں عورتیں اور بچے ساتھ نہیں رہتے۔ ان کی موجودگی نئے مصائب پیدا کرتی ہے۔“

کبریا نے توقیر سے مائیک لے کر کہا ”ہیلو ہیلو۔ میں کبریا

حسن بول رہا ہوں۔ میرے ساتھ میری شریک حیات ہے۔ میں اس کے ساتھ کنٹرول لائن پار کروں گا۔ اگر یہ آپ کے اصولوں کے خلاف ہے تو میں نہیں آؤں گا۔ میرے پاس ایک اہم ویڈیو فلم ہے۔ میں اسے توقیر اور ربانی کے حوالے کر رہا ہوں۔“

دوسری طرف ذرا دیر خاموشی رہی پھر کہا گیا ”انتظار کرو۔ ہم ابھی رابطہ کریں گے۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ تنظیم کے صدر دفتر میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ ایک نے کہا ”یہ کبریا حسن جہاد کرنے گیا تھا یا شادی کرنے۔ وہ عورت مصیبت بن جائے گی۔ کنٹرول لائن پار نہیں کر سکے گی۔“

دوسرے مجاہد نے کہا ”اس نے پہلے ہی ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور اب ایک اہم ویڈیو فلم لے کر آرہا ہے۔ اسے طعنے نہ دو۔ وہ شادی کرنے نہیں گیا تھا۔ حالات سے مجبور ہو گیا ہو گا۔“

ایک اور مجاہد نے کہا ”اسے جو فرائض ادا کرنے تھے۔ وہ ان سے زیادہ کارکردگی کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ مسئلہ اس عورت کا ہے۔ رات کو سخت برف باری ہوئی ہے۔ تاریکی اور دھند میں اندھے بن کر سرحدی دلال کے ساتھ آنا پڑتا ہے۔ وہ دلال ایک عورت کو لانے پر راضی نہیں ہو گا۔ ایک عورت کی وجہ سے وہ خود گرفتار ہو سکتا ہے۔ وہ یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہے گا۔“

”پھر پتا نہیں وہ عورت کیسی ہو۔ وہ بھارتی جاسوسہ ہو سکتی ہے۔ وہ دھوکا کھا رہا ہو گا ہم بھی دھوکا کھائیں گے۔“ ”ہم دھوکا نہیں کھائیں گے۔ اسے آزما لیں گے۔ جاسوسہ ہوگی تو گولی مار دیں گے۔“

ایسے وقت کبریا کی ماں دفتر میں آئی۔ ان سے پوچھا ”میرے بیٹے کی کوئی خبر ملی۔“

”جی ہاں۔ آپ کے لیے خوش خبری ہے۔ کبریا حسن زندہ سلامت ہے۔ انشاء اللہ کل تک یہاں آجائے گا۔ ماں کی دعائیں خالی نہیں جاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کر لی ہے۔“

وہ خوشی سے کھل گئی ”یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں ابھی جا کر شکرانے کی نماز پڑھوں گی۔“

ایک نے پوچھا ”کیا مقبوضہ کشمیر میں آپ کا کوئی رشتہ دار ہے؟“

”نہیں۔ کوئی ہوتا تو یہ اطمینان رہتا کہ بیٹا گم نہیں ہوا ہے۔ اپنے رشتے داروں کے پاس ہے۔“

”اس نے وہاں شادی کر لی ہے۔“

”کیا؟“ وہ حیران ہوئی پھر خوش ہو کر بولی ”اس کا مطلب ہے۔ میرا بیٹا خوش ہے۔ صحت مند ہے، کیا میری بہو کو ساتھ لا رہا ہے؟“

”وہ لانا چاہتا ہے مگر ہم تشویش میں مبتلا ہیں۔“

ماں نے انہیں سوا لیہ نظروں سے دیکھا۔ ایک نے کہا ”کنٹرول لائن کا راستہ بہت دشوار گزار ہے۔ رات کے وقت برف باری اور گہری دھند میں ایک عورت سفر نہیں کر سکے گی۔ کوئی برا وقت آئے تو بھاگنا اور چھپنا پڑتا ہے۔ آپ کی بہو ایسا نہیں کر سکے گی۔ سرحدی دلال کے لیے مصیبت بن جائے گی۔ اس کے ساتھ آپ کا بیٹا بھی گرفتار ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ مارا جاسکتا ہے۔“

وہ خوف سے لرز گئی ”نہیں۔ میرا بیٹا زندہ سلامت آئے گا۔ پتا نہیں اس نے شادی کیوں کی، یہاں آکر کر سکتا تھا۔ اس سے کہو۔ دلہن کو میکے چھوڑ کر آئے۔ وہ بعد میں آجائے گی۔ میں اس کے لیے تڑپ رہی ہوں۔“

وہ سب ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے کہ یہی مناسب رہے گا۔ وہ فی الحال اپنی دلہن کو میکے میں چھوڑ دے۔ وہ پھر کبھی آجائے گی۔ وہ وائرلیس کے ذریعے پھر رابطہ کرنے لگے۔ تیز برفانی ہواؤں کے باعث رابطے میں دشواری ہو رہی تھی۔ انہیں دوسری طرف سے توقیر کی آواز سنائی دی۔ ادھر سے کہا گیا ”کبریا سے کہو۔ حالات موافق نہیں ہیں۔ وہ اپنی شریک حیات کو فی الحال میکے میں چھوڑ دے ہم اسے بعد میں لے آئیں گے۔“

توقیر نے کہا ”دلہن کا کوئی میکا نہیں ہے۔ کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ کبریا اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ میں اس سے بات کر چکا ہوں۔“

”اسے سمجھاؤ۔ اسے یہاں لانے والا ایجنٹ ایک عورت کو لانے کے لیے راضی نہیں ہوگا۔“

دوسری طرف سے کبریا کی آواز سنائی دی ”میں ایجنٹ کو منہ مانگی رقم دوں گا۔ آپ اسے راضی کریں۔“

”ہم اس سے معاملہ طے کریں گے۔ وہ راضی نہ ہو تو تم یہاں تنہا آؤ گے۔“

”میں نہیں آؤں گا۔ ویڈیو کیسٹ توقیر اور ربانی کو دے دوں گا۔ میرا فرض پورا ہو جائے گا۔“

ماں نے کہا ”وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ کیا ماں کو چھوڑ کر دشمنوں میں بیوی کے ساتھ رہے گا۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔“

ایک نے کہا ”موسم خراب ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں۔

کتنی مشکل سے باتیں ہو رہی ہیں۔“

وہ اس سے مایک لے کر اپنے منہ کے قریب آکر چپ ہو کر بولنے لگی ”بیٹے۔ کبریا حسن! میں تمہاری ماں بول رہی ہوں۔ اتنے خراب موسم میں تمہیں تلاش کرتے ہوئے آئی ہوں۔ کیا میرے پاس نہیں آؤ گے؟ مجھے چھوڑ کر یہیں رہ جاؤ گے؟“

”اماں۔ میں تمہاری بہو لے کر آ رہا ہوں۔ اتے یہاں چھوڑ کر وہیں آؤں گا۔“

”بیٹے مجھے بہو کی خوشی ہے مگر اتے زحمت نہ بناؤ۔ بعد میں رحمت بن کر آنے دو۔“

شاداں دوسری طرف یہ باتیں سن رہی تھی۔ یہ اتھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اب اپنے کبریا کے لیے مصیبت بن رہی ہے۔ وہ تنہا آزاد کشمیر جاسکتا ہے۔ ماں کے گلے لگ سکتا ہے۔ پچھڑے مل سکتے ہیں لیکن وہ ماں بیٹے کو جدا کر رہی ہے۔ وہ بولی ”کبریا ماں سے وعدہ کرو۔ تم تنہا آ رہے ہو۔“

کبریا نے کہا ”تم چپ رہو۔ کیا میں نے تمہیں چھوڑ کر جانے کے لیے دلہن بنایا ہے؟“

توقیر نے وائرلیس کے ذریعے کہا ”آپ ایجنٹ سے بات کریں۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں کو لے جانے کے لیے راضی ہو جائے۔ جب راضی نہیں ہوگا۔ تب دیکھا جائے گا۔ موسم بہت خراب ہے۔ میں انہیں پناہ گاہ کی طرف لے جا رہا ہوں۔ ایجنٹ سے بات کر کے بتائیں۔ وہ آج رات کب تک آئے گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ شاداں نے کہا ”کبریا ضد نہ کرو۔ میں آج نہیں توکل۔ کسی دن بھی آجاؤں گی۔“

کبریا نے کہا ”میں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ یہ مجاہدین اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے آگے چلے جائیں گے۔ میں ماں کی گود میں پہنچ جاؤں گا۔ تمہارا کہاں ٹھکانا ہوگا؟ ان ویرانوں میں بھٹکتی رہو گی۔ دشمن عزت بھی لیں گے۔ جان بھی لیں گے۔ کیا تم مجھے بے غیرت سمجھتی ہو؟“

توقیر نے کہا ”بے شک مردانگی یہ گوارا نہیں کرتی کہ مشکل وقت میں اپنی عورت کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔ ہو سکتا ہے ایجنٹ راضی ہو جائے۔ اگر راضی نہ ہو تو کیا ہوگا؟“

”میں ایجنٹ کے بغیر کنٹرول لائن پار کروں گا۔ ہر حال میں شاداں کو لے جاؤں گا۔“

”پاگل ہو رہے ہو۔ ایک تو کنٹرول لائن تک پہنچنا ہی دشوار ہوگا۔ بھارتی فوجیوں سے ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ تاریکی اور دھند میں پتا نہیں چلے گا کہ سناتے ہوئے گولیاں کہاں سے آ رہی ہیں۔“

تحقیق

”یہ تو صحیح طور پر معلوم نہیں کہ لسن چبانے سے وزن کم ہوتا ہے یا نہیں.... لیکن اتنا ضرور ہے کہ لوگوں کو آپ تھوڑے سے دبلے دکھائی دینے لگتے ہیں کیونکہ وہ آپ سے کافی دور کھڑے ہو کر آپ کو دیکھتے ہیں۔“

محمد مجاہد بھٹہ 03045503086

ہم اندھیرا ہونے سے پہلے اسے گھیر سکیں گے۔ وہ کتا کل سے ہمیں اپنے پیچھے دوڑا رہا ہے۔“

افسر پلوی کو تھینچ کر لے جا رہا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی پٹائی کرنے لگا۔ سالی نخرے کرتی ہے۔

وہ اسے مارتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ ”تیرا باپ مجھے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ وہ بڑھیا ہم سب کو کتا کہہ رہی تھی۔ اب ہم دکھائیں گے کہ کیا ہیں۔ میرے بعد سب ہی تجھے بھنبھوڑیں گے۔ آخر کتے ہیں۔ چودہ انجکشن ضرور لگیں گے۔ تجھے تو مرنا ہی مرنا ہے۔“

وہ اسے ہاتھوں سے اور بھاری بھر کم فوجی جوتوں سے مار رہا تھا۔ وہ مار کھاتے کھاتے بے حال ہو گئی۔ وہ اسے جھاڑیوں کی طرف گھسیٹ کر لے جاتے ہوئے بولا ”کوئی ہمیں الزام نہیں دے گا کہ ہم نے اس بستی سے تجھے اغوا کیا ہے۔ تیری بستی میں تو آنگ وادی آتے ہیں۔ تیرا کھیا باپ انہیں پناہ دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک آنگ وادی نے تجھے یہاں لاکر مار ڈالا ہے۔“

اس لڑکی میں جدوجہد کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی ”مجھ پر ظلم نہ کرو۔ تم تو ہمارے فوجی ہو۔ ہماری رکھشا کے لیے ہو۔ ہمارا دھرم ایک ہے۔ ہمارا کرم ایک ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔ ہمارا دھرم ایک ہے۔ میں اپنے دھرم کی لڑکی کی عزت نہیں لوٹ رہا ہوں۔ دنیا والوں کو یہی معلوم ہو گا کہ یہاں آنے والے مسلمان آنگ وادی دہشت بھی پھیلاتے ہیں اور ہندو ناریوں کی عزت سے بھی کھیلتے ہیں۔ چل تو مجھے جھی آنگ وادی سمجھ لے۔“

وہ اپنی عزت بچانے کے لیے جتنی جدوجہد کر سکتی تھی۔ کر چکی تھی۔ مار کھاتے کھاتے زخمی ہوتی رہی تھی۔ بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ اب اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ آخری وقت خدا ہی یاد آتا ہے۔ اس نے بڑے کرب سے پکارا ”ہے بھگوان...!“

ربانی نے کہا ”کارگل سے بھبھیر تک کنٹرول لائن ہے۔ ادھر تار کانٹے لگے ہوئے ہیں۔ بھارتی فوجی چوکس رہتے ہیں۔ باقی سرحدی علاقوں میں تار کانٹے نہیں ہیں۔ سیکڑوں میل تک پھیلی ہوئی سرحد پر باقاعدہ پھرا نہیں رہتا۔ سرحد کے چپے چپے پر پھرا لگانے کے لیے لاکھوں فوجی جوانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے مسلسل پھرا نہیں رہتا۔ پٹرولنگ آرمی کے جوان کبھی کبھی ادھر سے گزرتے ہیں۔ سرحدی دلال جانتے ہیں کہ کس وقت کس جگہ سے سرحد پار کرنی چاہیے۔ تم یہاں کے راستے نہیں جانتے ہو۔ بھٹک کر دشمنوں کے چنگل میں پھنس جاؤ گے۔ ایجنٹ کے بغیر ادھر جانا نادانی ہوگی۔“

کبریا نے کہا ”ہمیں کسی پناہ گاہ میں پہنچا دو۔ میں سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

وہ سب اپنا سامان اٹھا کر وہاں سے ایک سمت جانے لگے۔ توقیر نے کہا ”معاملہ طے ہو جائے گا تو ابھی وائرلیس پر بتا دیا جائے گا کہ ایجنٹ آدھی رات کے بعد کب آئے گا اور تم دونوں کے کوڈ ورڈز کیا ہوں گے۔ تمام معاملات طے ہونے کے بعد ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

وہ شاداں کے ساتھ سر جھکائے توقیر اور ربانی کے پیچھے جا رہا تھا۔ یہ طے کر چکا تھا کہ جان جائے یا رہے اپنی جان کو یہاں چھوڑ کر تنہا نہیں جائے گا۔

○☆☆○

اس فوجی جیب میں کھیا کی جوان بیٹی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جیب تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ وہ بڑی دیر تک جینتی چلاتی اور تڑپتی رہی۔ کسی طرح خود کو چھڑا کر جیب سے کود کر بھاگ جانے کی کوششیں کرتی رہی۔ افسر قہقہے لگا رہا تھا۔ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ کبھی اسے بھاگنے کے لیے ڈھیل دے رہا تھا۔ کبھی دیوچ رہا تھا۔ یوں شکار کو بے بس کر کے مزے لے رہا تھا۔

اس نے کئی کلومیٹر دور آنے کے بعد کہا ”بڑی بھرپور ہے۔ بڑی گرم ہے۔ یہ جہاں رہتی ہوگی وہاں برف پگھل جاتی ہوگی۔ میں بھی پگھل رہا ہوں۔ جیب روکو۔ میں اسے جھاڑیوں کے پیچھے لے جاؤں گا۔“

جیب رک گئی۔ افسر نے اتر کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ خود کو چھڑانے لگی۔ اس نے کہا ”بجلی کی طرح مچلتی ہے۔ کیا نام ہے تیرا؟“

جبار جان نے کہا ”میں نے بستی میں سنا ہے۔ اس کا نام پلوی ہے۔ حضور نام سے کیا لینا ہے۔ کام سے کام رکھیں پھر جلدی نکل چلیں۔ وہ آنگ وادی شاداں کے ساتھ آگے گیا

صاحب کا جھوٹا تو ہمیں ملتا ہی رہتا ہے۔“

”ہاں مگر بڑی دیر ہو رہی ہے۔ اس آتنگ وادی کے پیچھے جانا ہے۔ ذرا آگے جا کر صاحب کو آواز دے۔ نہیں تو وہ چھوگری سے چپک کر ہی رہ جائے گا۔“

دو سپاہی وہاں سے چلتے ہوئے جھاڑیوں کی طرف آنے لگے۔ دلبر خان نے سرگوشی میں پلوی سے کہا ”زمین پر لیٹ جاؤ۔ جلدی کرو۔“

وہ اس کے قریب زمین پر لیٹ گئی۔ اس نے جھاڑی کے پیچھے سے نشانہ لیا پھر گولی چلا دی۔ ٹھانیں کی آواز کے ساتھ سپاہی کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ اس نے دوسری گولی چلانے میں دیر نہیں کی تھی۔ دوسرے کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ دوسری گولی چلتے ہی وہ بھی لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر گر پڑا۔ فائرنگ کی پہلی آواز پر ہی جبار جان دوڑتا ہوا جیب کے پیچھے آکر چھپ گیا تھا۔ تیسرا سپاہی چیخ کر پوچھ رہا تھا ”کون ہے؟ کون فائرنگ کر رہا ہے؟ سر ادھر تو آپ ہیں۔ کیا آپ نے فائرنگ کی ہے؟“

دلبر خان نے پلوی سے کہا ”تم ان سے بولو۔ انہیں ادھر بلاؤ۔“

وہ زمین پر لیٹے ہی لیٹے بولی ”میں نے فائرنگ کی ہے۔ تم اپنے صاحب کے بعد ایک ایک کر کے میرے پاس آنا چاہتے تھے۔ آجاؤ۔ ایک ایک کر کے آتے رہو۔“

جبار جان نے چیخ کر پوچھا ”پلوی ہمارا صاحب خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں ہے؟“

وہ بولی ”میرے پاس آؤ۔ تم بھی بولنا بھول جاؤ گے۔“ جبار جان نے سپاہی سے کہا ”آگے نہ جانا۔ اس لڑکی نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ صاحب کی آواز نہیں آرہی ہے۔ تم ایک لمبا چکر کاٹ کر جھاڑی کے پیچھے جاؤ۔“

سپاہی نے کہا ”میں اکیلا جاؤں اور تم یہاں چھپے رہو گے؟“

”میں سپاہی نہیں ہوں۔ مخبری کرتا ہوں۔ اس آتنگ وادی کو صورت سے پہچانتا ہوں۔ اسی لیے مجھے اس کے پیچھے بھیجا گیا ہے۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔ ورنہ صاحب کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔“

وہ سپاہی ایک طرف چلتا ہوا ایک لمبا چکر کاٹتا ہوا اس جھاڑی کی طرف جانے لگا۔ دلبر خان بھی اپنی جگہ بدل رہا تھا۔ اسے دیکھتا جا رہا تھا پھر اس نے اندازہ کیا کہ وہ شوٹنگ ریج میں ہے۔ تب اس نے گولی چلا دی۔

دلبر خان سے اندازے کی غلطی ہوئی تھی۔ وہ ریج میں

اچانک اس افسر کے حلق سے کراہ نکلی۔ ایک کلمہ ہی کا پھل اس کے سر پر پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ ایسے کاری ضرب لگائی گئی تھی کہ اس کے منہ سے پھر دوسری آواز نہیں نکل سکی۔ وہ ایک طرف ڈھلک کر زمین پر آگیا۔

پلوی ایک دم سے ساکت ہو گئی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ سامنے ایک لمبا ترنگا جوان کھڑا ہوا تھا۔ اس کی کلمہ ہی کا پھل لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کلمہ ہی کو ایک طرف پھینک کر افسر کا ریوالتور اٹھا رہا تھا۔ افسر ہاتھ پاؤں جھٹک کر تڑپ رہا تھا۔ اس جوان نے اپنے ایک پاؤں کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے حلق پر رکھ کر زور سے دبایا۔ وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا پھر اس نے اپنی کبل نما شال اتار کر پلوی پر ڈالی۔ وہ اس شال کو اپنے بدن سے لپیٹتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس جوان نے پوچھا ”تم کون ہو؟“

”میرا نام پلوی ہے۔ میں بہت کے کھیا کی بیٹی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔ کہنے لگی ”تم بھگوان کا روپ ہو۔ تم نہ آتے تو یہ میری عزت بھی لیتا اور جان بھی لے لیتا۔ تم میرے لیے دیوتا سامان ہو۔“

وہ اسے قدموں سے اٹھاتے ہوئے بولا ”میں دیوتا نہیں ہوں۔ دلبر ہوں۔ میرا نام دلبر خان ہے۔ تمہاری بستی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے رک گیا۔“

پلوی نے مردہ افسر کی طرف دیکھا پھر کہا ”جھاڑیوں کے اس پار اس کے سپاہی ہیں۔ سب کے پاس بندوقیں ہیں۔“ ”جانتا ہوں۔ میں انہیں بھی دیکھ چکا ہوں۔ ان سے بھی نمٹنا ہو گا۔“

”وہ چار ہیں۔ ہمیں مار ڈالیں گے۔ یہاں سے چپ چاپ نکل چلو۔“

”نکلنے کا راستہ کہاں ہے۔ اس جھاڑی کے آگے کھلا میدان ہے۔ کہیں بھی جھاڑیاں، پتھر اور ٹیلے نہیں ہیں۔ ہم چھپ کر نہیں جاسکیں گے۔ یہ ہمیں دوڑا دوڑا کر ماریں گے۔ یہ چھپنے کی جگہ ہے۔ یہاں میں کچھ کر سکوں گا۔ خدا کو منظور ہو گا تو ہم یہاں بچ سکیں گے۔“

وہ جھاڑیوں کے پیچھے ایک طرف جا کر دیکھنے لگا۔ دور سڑک کے کنارے جیب کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں جبار جان تین سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا ”ہمارا صاحب بڑا رنگ رنگیلا ہے۔ مزے لوٹ رہا ہے۔“ ایک سپاہی نے کہا ”تمہاری رال کیوں ٹپک رہی ہے۔“

نہیں تھا۔ اسے گولی لگی۔ وہ زخمی ہو کر ایک طرف بھاگنے لگا پھر ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جبار جان کی سمجھ میں آیا کہ وہ بھی گولی کھا کر گر پڑا ہے۔ یہ فائرنگ پلوی نہیں کر رہی ہے ایک یا ایک سے زیادہ لوگ اس کی مدد کے لیے آگئے ہیں۔ وہاں سے بھاگ جانا دانش مندی ہوگی۔

اس نے جپ میں بیٹھ کر اسے اشارت کیا پھر ڈرائیو کرتے ہوئے آگے جانے لگا۔ سیاہی نے اٹھتے ہوئے آواز دی ”روکو جبار جان گاڑی روکو۔ تجھے بھی لے چلو۔“

مگر اس نے سنی اُن سنی کر دی۔ گاڑی کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کا یہ یقین پختہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جائے گا۔ اب تک یہی ہوتا آ رہا تھا جو اسے مارنے آتا تھا، وہ خود مرجاتا تھا یا پھر وہ دشمن سے بچ نکلتا تھا۔ جیسا کہ اب جان بچا کر جا رہا تھا۔

نصوحہ پیشکش: بابو جی نشتہ ایڈیٹر



شاداں اور کبریا لکڑی کے ایک چھوٹے سے مکان میں تھے۔ توقیر اور ربانی نے پھر وائریس پیر رابطہ کیا تھا۔ ادھر سے کہا گیا تھا کہ ایجنٹ راضی نہیں ہو رہا ہے۔ وہ کسی عورت کے لیے خطرہ مول لینا نہیں چاہتا ہے۔

توقیر اور ربانی سے کہا گیا کہ ”وہاں شاداں کا کوئی تو ہوگا۔ وہ دونوں اسے اس کے کسی عزیز کے ہاں پہنچا دیں۔ ایجنٹ صرف کبریا کو آج رات دو بجے سرحد پار کرائے گا۔“

بات پوری نہیں ہو سکی تھی۔ وائریس میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ توقیر اور ربانی بڑی دیر تک اس کی خرابیاں دور کرنے کی کوششیں کرتے رہے لیکن وہ قابل استعمال نہ بن سکا۔ آخر ربانی نے کہا ”کوئی ماہر مکینک ہی اسے ٹھیک کر سکے گا۔ یہ ہمارے بس کا نہیں ہے۔“

توقیر نے کہا ”چلو اس حد تک بات ہو گئی کہ ایجنٹ رات کے دو بجے تک یہاں آنے والا ہے۔ اب ہم یہاں سے جائیں گے۔ شاداں کو ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔“

کبریا نے کہا ”شاداں نہیں جائے گی۔ تم دونوں نے ہمارا بڑا ساتھ دیا ہے۔ ہم تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“

ربانی نے کہا ”کبریا ضد نہ کرو۔ شاداں ہماری بہن ہے۔ ہم ایک مسلمان کے گھر میں اسے لے جائیں گے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ اسے بیٹی اور بہن بنا کر رکھیں گے۔ شاداں! تم حالات کو سمجھ رہی ہو۔“

”سمجھ رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ کبریا نے کہا ”بکو اس مت کرو۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔“

”میں پھر آجاؤں گی۔ کتنے ہی ستم رسیدہ قافلے سرحد پار کر کے آزاد کشمیر جاتے ہیں۔ میں بھی اسی قافلے کے ساتھ آجاؤں گی۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔ جلد ہی آؤں گی۔“

کبریا نے کہا ”چلو میں بھی واپس چلتا ہوں۔ ہم اسی دن کسی ستم رسیدہ قافلے کے ساتھ سرحد پار کریں گے۔“ ”ضد نہ کرو۔ سرحد کے پار تمہاری والدہ انتظار کر رہی ہیں۔ کچھ ان کا تو خیال کرو۔“

”اماں کا خیال رکھنے کے لیے ابا زندہ سلامت ہیں۔ تمہارا خیال رکھنے والا کون ہے۔ میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمہیں شریک حیات بنایا ہے۔ ساری زندگی تمہارا شریک رہوں گا۔“

توقیر نے کہا ”تم اپنی ضد میں اپنے فرائض بھول رہے ہو۔ وہ ویڈیو کیسٹ ہمارے دفتر تک کیسے پہنچے گی۔“

”اسے میں لایا ہوں۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ میں ہر حال میں اسے پہنچاؤں گا۔ مجھ سے بحث کرنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہوگی۔ شاداں میرے ساتھ سرحد پار کرے گی یا میں اس کے ساتھ پیس رہ جاؤں گا۔“

شاداں نے کہا ”نہیں کبریا آج تمہیں ہر حال میں اس پار جانا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“

توقیر اور ربانی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کہا ”مجاہد کو عاشق نہیں بننا چاہیے اور عاشق کو مجاہد نہیں بننا چاہیے۔“

”ہم جارہے ہیں۔ یہاں ہوشیار رہنا۔ اس ویرانے میں یہی ایک کایج ہے۔ پٹرولنگ پولیس کی گاڑی ادھر سے گزر سکتی ہے۔“

محمد مجاہد بھٹہ 03045503086

وہ دونوں اپنا اپنا بیگ اٹھا کر اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ لکڑی کا ایک بہت ہی شکستہ سا مکان تھا۔ صرف ایک کمرے کی چھت سلامت تھی۔ دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ وہاں کبھی کوئی رہتا ہوگا۔ اب وہاں سردیوں میں برف جمی رہتی ہے۔ ادھر کوئی نہیں آتا۔ کبھی مجاہدین ادھر سے گزرتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے ہیں مگر دیر تک وہاں نہیں رہتے۔ ایسی جگہ جاسوس یا پٹرولنگ پولیس والے ضرور آتے ہیں۔ وہ بھی وہاں چند گھنٹے گزارنے کے تھے۔ ادھی رات کے بعد جانے والے تھے۔

اس کمرے میں ایک پرانی سی لالین کی روشنی تھی۔ اس روشنی میں ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کبریا لالین اٹھا کر اس کمرے میں ہر طرف جا کر دیکھنے لگا۔ ایک صندوق میں کچھ سامان کے ساتھ ایک لمبا سا چھرا رکھا ہوا

”باہر برف گر رہی ہے۔ ہم برف پر چلیں گے تو پتا نہیں چلے گا کہ آگے کوئی گڑھا ہے یا نہیں۔ ایسے کسی گڑھے میں گرنے والا برف کے اندر ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ایسی مضبوط رسی ہو تو اسے تھام کر باہر آسکتا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولا۔ اسے اپنے جسم و جان سے لگائے رہا۔ اس کی سانسوں میں سماتا رہا اور اسے اپنی سانسوں میں اتارتا رہا۔ وہ بولی ”تمہیں کچھ تو سوچنا چاہیے۔ اب بھی وقت ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ جانے دو۔“

شاداں نے کہا ”میں غسل خانے جاؤں گی۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

وہ ایک لاناٹھی لے کر جانے لگی۔ دونوں اندھیرے کے
عادی ہو گئے تھے۔ سمت کا اندازہ تھا۔ وہ لاناٹھی ٹپکتے ہوئے
دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ غسل خانے کی ٹوٹی ہوئی چار

اس نے طے کیا تھا کہ ایجنٹ کا انتظار نہیں کرے گا۔ جب وہ شاداں کے کام نہیں آسکتا تھا تو پھر اس سے کوئی کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ لاشی ٹیکتا ہوا دروازے سے باہر آیا۔ دائیں طرف غسل خانہ تھا۔ تاریکی اور گہری دھند کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے کہا ”شاداں میں نے سارا سامان اٹھالیا ہے۔ اب یہاں سے چلنا ہے۔“

نہ ہوں کی آواز آئی نہ ہاں کی، مسلسل خاموشی رہی۔
اس نے پریشان ہو کر پوچھا ”کیا بات ہے؟ تم بولتی کیوں نہیں
ہو؟ شاداں! کچھ بولو نہیں تو میں آ رہا ہوں۔“

وہ اس سے جھوٹ بول کر اسے دھوکا دے کر اس مکان سے چلی آئی تھی۔ بڑی دیر تک کشمکش میں رہنے کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ چھوڑ کر جائے گی تو کبیرا اسے ڈھونڈتا رہے گا۔ آخر کب تک ڈھونڈے گا۔ آج نہیں تو کل تھک ہار کر مایوس ہو کر اس یا رچلا جائے گا۔

آس پاس نظر نہیں آ رہا تھا پھر بھی وہ ادھر ادھر دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ”شاداں! میں سمجھ گیا۔ تم میرے لیے مصیبت نہیں بننا چاہتیں۔ تم نے یہ سوچ لیا کہ مجھ سے دور ہو جاؤ گی۔ کہیں کم ہو جاؤ گی تو میں مایوس ہو کر چلا جاؤں گا۔ تم سن رہی ہو تو سن لو۔ میرے پاس نہیں آؤ گی تو میں اس پار نہیں جاؤں گا۔ میں بیمار ہوں شاداں! تم نے یہ نہیں سوچا کہ ایک بیمار کو چھوڑ کر جا رہی ہو۔“

ہر طرف سفید ملگجی دھند تھی۔ سناٹا تھا۔ ویرانی تھی۔ اس ویرانے میں وہ بولنے والا تھا۔ سننے والی نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک اندھے کی طرح لاشی ٹیکتا ہوا کہاں جا رہا ہے۔ راستہ کہاں ہے۔ منزل کہاں ہے۔ کچھ پتا نہ تھا۔ اب تو منزل وہی ہوتی جہاں وہ مل جاتی۔

اسے وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ ویسے آدھی رات ہو چکی تھی۔ باقی آدھی رات بھی اپنے وقت پر گزرنے والی تھی۔ شاداں لاشی ٹیکتے ہوئے اس مکان سے نکل آئی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ آگے جا کر پتا نہیں کب تک بھٹکنا ہے۔ ویسے بھٹکتے ہوئے کسی نہ کسی بستی تک پہنچ سکتی تھی۔ مسلمانوں کے کسی گھر میں پناہ مل سکتی تھی۔ اگر بھارتی فوجی اس کا محاسبہ کرتے تو وہ کہہ دیتی اپنے شوہر سے بچھڑ گئی ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ ایک مجاہد کا ساتھ دینے کے جرم میں اسے گولی مار دی جاتی۔

کبریا کے بغیر جینا مرنا برابر تھا۔ موت کا ذرا بھی ڈر ہوتا تو وہ ایسا قدم نہ اٹھاتی۔ اب وہ یہی دعا مانگ رہی تھی کہ کبریا اسے دیوانے کی طرح تلاش نہ کرے۔ جلد ہی مایوس ہو کر چلا جائے۔

محمد مجاہد 03045503086

وہ کہیں بھٹک رہا تھا۔ یہ کہیں بھٹک رہی تھی۔ ہو سکتا تھا دونوں ایک دوسرے سے دور نہ ہوں۔ شاید پکارنے سے ایک دوسرے تک آواز پہنچ سکتی ہو لیکن پکارنا نادانی ہوتی۔ اس لیے کبریا خاموش تھا۔ گھڑی کے کانٹے چیونٹی کی رفتار سے بہت آہستہ آہستہ چلتے ہیں مگر انسانی رفتار سے آگے نکل جاتے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ مرغ کی بانگ سنائی دی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ دو باتوں کا اندازہ ہوا کہ صبح ہونے والی ہے اور کوئی بستی کہیں قریب ہی ہے۔

کبریا بھی چلتے چلتے ٹھٹھک گیا۔ اس نے بھی مرغ کی بانگ سنی تھی۔ جدھر سے آواز آئی تھی ادھر کوئی بستی ہوگی۔ اس کے دل نے پوچھا ”کیا شاداں یہاں پہنچی ہوگی؟“

دوسری طرف شاداں کھڑی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کیا مجھے بستی میں جانا چاہیے؟ پتا نہیں یہاں کے لوگ کیسے ہوں گے؟ اسے پناہ دیں گے یا نہیں؟

دور ایک لائین کی روشنی دکھائی دی۔ کوئی دروازہ کھول کر باہر آیا تھا۔ وہ دھندلی روشنی سے اندازہ کر رہی تھی کہ لائین روشن ہے مگر وہاں چند افراد ایک جیپ کے پاس موجود تھے۔ دور سے نظر نہیں آرہے تھے۔ وہاں جبار جان بونٹ کھول کر انجن پر جھکا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ اس گاڑی نے کہاں آکر دھوکا دیا ہے۔ سالی عورت کی طرح نخرے کر رہی

ہے۔ چلنے سے انکار کر رہی ہے۔ چلے گی کیسے نہیں۔ اس کا تو باپ بھی چلے گا۔ ابھی اشارت کرتا ہوں۔

وہ اسٹیمرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی کو اشارت کرنے سے پہلے ہیڈ لائٹ کو آن کیا۔ دونوں ہیڈ لائٹس کی روشنی ذرا دور تک گئی تو وہ ایک دم سے چیخ کر بولا ”شاداں!“

ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑتے ہی وہ بوکھلا گئی تھی پھر اسے جبار جان کی آواز سنائی دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگنے لگی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ”اے دوڑو، پکڑو۔ اسے جانے نہ دو۔“

وہ پاس والی سیٹ سے رائفل اٹھا کر ادھر دوڑتے ہوئے جانے لگا۔ باقی چند افراد وہاں کے رہنے والے تھے۔ وہ اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے گئے لیکن ہیڈ لائٹس کی روشنی سے ہٹتے ہی اندھے ہو گئے۔ دھند میں دکھائی نہیں دیا کہ جبار جان کہاں گیا ہے اور ان نہتوں کو کہاں جانا ہے۔

کبریا نے بھی دور سے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اپنی جان کو دیکھا تھا۔ وہ بھی لاشی ٹیکتا ہوا دوڑتا ہوا، روشنی سے بچتا ہوا ادھر جانے لگا۔ آنکھ والوں کی اندھی بھاگ دوڑ پھر شروع ہو گئی۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک دوسرے کی آوازیں سن کر سمجھ سکتے تھے کہ کون کہاں ہے۔

جبار جان نے کبریا کو نہیں دیکھا تھا۔ شاداں کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔ آگے بھی ایسے آثار نظر نہیں آئے کہ کبریا اس کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک جگہ رک کر آواز دی ”شاداں! جہاں ہو رک جاؤ۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ تمہیں اس آتنگ وادی کے ساتھ بارڈر کے اس پار پہنچا دوں گا۔“

وہ کبریا کو آتنگ وادی کہہ رہا تھا اور دوستی بھی ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی فائر کی آواز گونجی۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی۔ وہ خوف سے چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو اور اپنے جسم کو ٹٹول کر یقین کرنے لگا کہ ابھی زندہ ہے۔ وہ اس طرح مرنے والا نہیں ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک برف کی سطح پر بڑا رہا۔ کان لگا کر آہٹیں سننے کی کوششیں کرنے لگا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دھند میں وہ دشمن اس سے آکر ٹکرا سکتا تھا۔ وہ رائفل کو زمین پر ٹیک کر چلنے لگا۔

اس کی چیخ سن کر کبریا نے پہلے یہی سمجھا کہ گولی لگی ہے۔ وہ مر چکا ہے یا زخمی ہوا ہے۔ اگر زخمی ہوا ہے تو اس کی تاک میں رہے گا۔ وہ محتاط ہو کر آگے بڑھنے لگا۔ پریشان ہو کر

تمہیں کیا ملا؟ پتا نہیں ہم کہاں آگئے ہیں۔“

اچانک ایک فائر ہوا۔ وہ اس کے ساتھ لیٹ کر لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ اسی لیے پہلے سے لیٹ گیا تھا۔ وہ دونوں اٹھ کر جھکتے ہوئے دوڑتے ہوئے ایک طرف جانے لگے۔ ادھر وہ بھی جھکتا ہوا دوڑتا ہوا جا رہا تھا پھر ایک جگہ پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ اب دور تک منظر واضح ہو گیا تھا۔ دور ایک چھوٹا سا پاکستانی جھنڈا ایک مدرسے کی دیوار پر لگا ہوا تھا۔

جبار جان بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ اندھا دھند تعاقب کرتا ہوا آزاد کشمیر کے کسی علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ خیریت اسی میں تھی کہ جدھر سے آیا تھا۔ ادھر واپس چلا جائے۔ وہ پلٹ کر بھاگنے لگا۔ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی اس کے قدموں کے پاس برف کے ذرات اڑے۔ وہ اونڈھے منہ گر پڑا۔ بہت دور ایک جھاڑی کے پیچھے کبریا دکھائی دیا۔ جبار جان زمین پر لڑھکتا ہوا ایک درخت کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں سے اس نے نشانہ لیا۔ ٹریگر کو دبایا۔ کھٹ کی آواز آئی۔ گولی نہیں چلی۔ وہ جلدی جلدی اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ کسی جیب میں کارتوس نہیں تھا۔ وہ سسم کر دور کھڑے ہوئے کبریا کی طرف دیکھنے لگا۔

کبریا نے فائر کرنے کے بعد کہا ”کب تک گولی چلاؤ گے۔ ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔“ اس کے پاس ایک بھی گولی نہیں رہی تھی۔ ہتھیار تو پھینکنا ہی تھا۔ وہ رائفل کو پھینکتا ہوا بولا ”میں دوستی چاہتا ہوں۔ مجھ سے سمجھوتا کرو۔ مجھ پر گولی نہ چلاؤ۔ میں سامنے آ رہا ہوں۔“

کوئی سمجھوتا نہ ہوتا تب بھی سامنے آنا ہی پڑتا۔ وہ درخت کے پیچھے سے نکل کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ کبریا شاداں کے ساتھ جھاڑی سے نکل آیا۔ اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا ”ایسا مہربان دشمن نہیں دیکھا۔ ہمیں دوڑانا ہوا ہماری منزل تک لے آیا ہے۔“

بستی کے گھروں کے دروازے بند تھے۔ کچھ عورتیں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ کچھ مرد چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ کبریا نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا ”آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ بتا دو اس جگہ کا نام کیا ہے؟“

ایک نے چھت پر سے کہا ”یہ سرحدی علاقہ ہے۔ تم مقبوضہ کشمیر کی سرحد سے چھ کلومیٹر دور آچکے ہو۔ اس جگہ کا نام کھوئی رٹ ہے۔“

کبریا نے کہا ”ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں آگے جانے کے

سوچنے لگا۔ ان کے آگے کہیں شاداں ہے۔ پتا نہیں سیدھی جا رہی ہے یا سمت بدل چکی ہے۔ وہ اسے آواز نہیں دے سکتا تھا۔ منہ سے آواز نکلتے ہی جبار جان گولی چلا سکتا تھا۔

وہ آگے بڑھتا ہوا سوچتا رہا۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ شاداں ایک بار نظر آنے پر پھر کہیں گم ہو جائے۔ اس نے خطرہ مول لیا۔ گھٹنے ٹیک کر لیٹ گیا پھر آواز دی ”شاداں! جہاں ہو رک جاؤ۔ تمہاری حماقت سے ہم دشمن کی نظروں میں آگئے ہیں۔“

ٹھائیس سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ گولی اس کے قریب سے گزری ہوگی لیکن وہ لینا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں کے بل ریٹکتا ہوا آگے جانے لگا۔ بہت دور سے شاداں کی آواز سنائی دی ”کبریا! مجھے آوازیں نہ دو۔ وہ شیطان تم پر گولی چلائے گا۔“

وہ آگے کی طرف دوڑتا ہوا پھر زمین پر گر کر بولا ”تم مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو میں اسی طرح آوازیں دیتا ہوں اس کے ہاتھوں مرجاؤں گا۔“

پھر گولی چلی۔ اس بار کبریا نے گولی چلنے کی سمت دوبار فائرنگ کی پھر ریٹکتے ہوئے جانے لگا۔ جبار جان بھی ریگ رہا تھا۔ ایک دوسرے کی فائرنگ سے بچنے کی یہی صورت رہ گئی تھی۔ وہ کبھی ریگ رہے تھے۔ کبھی اٹھ کر دبے قدموں آگے جا رہے تھے۔ جبار جان اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ شاداں تک پہنچنے کے لیے آگے بڑھتا رہے گا۔ بھٹکتا رہے گا۔

دونوں یہ نہیں جانتے تھے کہ شاداں کدھر ہوگی اور کون اس کے پاس پہلے پہنچے گا۔ اگر کبریا پہلے پہنچتا تو اسے لے کر چپ چاپ کہیں نکل جاتا۔ اگر جبار جان پہنچتا تو شاداں کو گرفت میں لے کر چیلنج کرتا کہ وہ سامنے نہیں آئے گا تو شاداں کو گولی ماری جائے گی۔

ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کی آوازوں کی سمت فائرنگ کر رہے تھے۔ گولیاں ضائع ہو رہی تھیں۔ ختم ہو رہی تھیں۔ رات بھی ختم ہو چکی تھی۔ آسمان کا اجالا بتا رہا تھا کہ سورج نکل چکا ہے مگر دھند لایا ہوا ہے۔

اب کچھ فاصلے تک نظر آنے لگا تھا مگر وہ ایک دوسرے کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ ایسے ہی وقت چند گز کے فاصلے پر شاداں نظر آئی۔ دوڑتے ہوئے آکر اس سے پلٹ گئی۔ سسکیاں لینے لگی۔ رونے لگی۔ کبریا اس کے ساتھ زمین پر لیٹ کر آہستگی سے بولا ”کیا رونے کے لیے چھوڑ کر گئی تھیں؟ یوں بھٹکانے سے

اصل حساب

ایک دوست :- بھی اس مرتبہ تو دو ہفتے کی چھٹیاں گزار کر بہت مزہ آیا۔

دوسرا دوست :- لیکن تم تو دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گئے تھے۔

پہلا دوست :- وہ تو ٹھیک ہے لیکن جوئی میں ایک ہفتے کی چھٹی گزار کر واپس آیا تو باس ایک ہفتے کی چھٹی پر چلے گئے۔



”جسے کلمہ پڑھنا نہیں آتا۔ میں اس کی بہن کبھی نہیں بنوں گی۔ کبریا اس کتے کو گولی مارو اور یہاں سے چلو۔“

کبریا نے کہا ”میں سوچتا رہتا تھا کہ پتا نہیں مجھے کس لمحے مرجانا ہے۔ ایسے وقت تم مجھے مل گئیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے مرنے والے کی آخری خواہش پوری ہو رہی ہو۔ تم میری آخری خواہش بن کر میرے ساتھ ہو میں اس کی بھی کوئی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔ بولو جبار! تمہاری خواہش کیا ہے؟“

”آخری خواہش ایک ہی ہے۔ مجھے قدرتی طور پر مرنے دو۔ مجھے گولی نہ مارو۔“

شاداں نے کہا ”نہیں کبریا! پتا نہیں کب اسے موت آئے گی یہ ابھی یہاں سے بچ نکلنے کے لیے ایسی خواہش بیان کر رہا ہے۔ یہ یہاں سے جائے گا تو پتا نہیں اور کتنی مسلمان لڑکیوں کی عزت کو کھلونا بنائے گا۔“

کبریا نے کہا ”میرے پوچھنے پر اس نے آخری خواہش بیان کی ہے۔ یہ چاہتا ہے۔ میں اسے گولی نہ ماروں۔ لہذا میں اسے گولی نہیں ماروں گا۔“

شاداں نے پوچھا ”یہ کیا کہہ رہے ہو۔ یہ شیطان میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔“

جبار جان نے کہا ”شاداں کی بات نہ سنو۔ تم مجاہد ہو۔ سچ مسلمان ہو۔ زبان سے نہ پھرنا۔ مجھے گولی نہ مارنا۔“

”جبار ہم دونوں زندگی اور موت کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں۔ میں تمہیں نہیں ماروں گا مگر زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر چلا جاؤں گا۔“

جبار جان نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے شاداں سے کہا ”اس مردود کو نشانے پر رکھو۔ بھاگنا چاہے تو

لے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔ ابھی ہم بھارتی فوج کے اس دلال سے نمٹ رہے ہیں پھر تمہارے ساتھ تنظیم کے دفتر جائیں گے۔“

جبار جان نے کہا ”مجھے بھارتی فوج کا دلال نہ کہو۔ اب میں آزاد کشمیر میں ہوں۔ آزاد مسلمان ہوں۔ کسی کا دلال یا غلام نہیں ہوں اور نہ رہوں گا۔ اب میں سچا مسلمان بن کر رہوں گا۔“

شاداں نے کہا ”اگر تو مسلمان ہے تو پہلا کلمہ سنا۔“

”آں؟“ وہ پریشان ہو کر بولا ”کیوں تجھے بچہ سمجھ کر مجھ سے کلمہ سننا چاہتی ہو۔“

”بچپن سے لے کر بڑھاپے کی آخری سانس تک کلمہ پڑھا جاتا ہے اور پڑھایا جاتا ہے۔“

کبریا نے کہا ”اور اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ مسلمان آخری سانس چھوڑنے سے پہلے کلمہ ضرور پڑھتے ہیں۔ تم مسلمان ہو تو تمہیں بھی پڑھنا چاہیے۔“

وہ سہم کر بولا ”کیا مجھے کلمہ پڑھا کر مارو گے؟ مگر نہیں۔ میں تو قدرتی موت مرنے والا ہوں۔ جو تیشی گرد دیال سنگھ نے کہا تھا۔ میری زندگی تھوڑی رہ گئی ہے۔ میں زیادہ دن نہیں جیوں گا۔“

”اگر جیوتیشی کی پیش گوئی درست ہے تو سمجھو۔ تمہاری زندگی پوری ہو چکی ہے۔ تم مرنے والے ہو۔“

”تم۔ تم مجھے مارو گے؟ نہیں۔ میں کسی کے ہاتھوں مارا نہیں جاؤں گا۔ میری زندگی پوری ہو چکی ہے تم مجھے قدرتی موت مرنے دو۔ جیوتیشی کی بات پوری ہونے دو۔“

”مجھے یاد آرہا ہے۔ پہلی ملاقات میں بھی تم نے یہی کہا تھا اور میں نے کہا تھا۔ تمہاری موت کی پیش گوئی ایک جیوتیشی نے کی ہے اور میری موت کی پیش گوئی میڈیکل رپورٹ کر چکی ہے۔ پتا نہیں کس وقت کس لمحے مجھے موت آجائے۔ اس سے پہلے تمہیں بھی مرنا چاہیے۔ ورنہ میرے بعد تم پھر شاداں کو پریشان کرو گے۔“

”میں قسم کھاتا ہوں۔ شاداں کو بہن سمجھتا رہوں گا۔ اسے عزت کے ساتھ ماں باپ کے پاس پہنچا دوں گا۔“

شاداں نے کہا ”اے کتے! تو ایسے کہہ رہا ہے۔ جیسے میں بیوہ ہو گئی ہوں اور تیرے ساتھ جانے والی ہوں۔ میرا سہاگ سلامت رہے گا۔ میں اپنے بیمار کو مرنے نہیں دوں گی۔“

”تم میری بہن ہو۔ میں اپنے بہنوئی کی لمبی زندگی کے لیے دعائیں مانگتا رہوں گا۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔“

زخمی کر دینا مگر گولی مار کر ہلاک نہ کرنا۔“

وہ وہاں سے چلتا ہوا ایک درخت کے پاس آیا۔ درخت کے سائے میں ذرا اونچائی تک برف جمی ہوئی تھی۔ وہ برف کی اونچائی تک آکر رسی کے ایک سرے کو درخت کی شاخ سے باندھنے لگا۔ جبار جان نے خوف زدہ ہو کر پوچھا ”یہ کیا کر رہے ہو؟ تم نے کہا تھا۔ مجھے ہلاک نہیں کرو گے۔“

”میں اپنی زبان پر قائم ہوں۔ تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔ اپنی طرح تمہیں بھی زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر چلا جاؤں گا۔ زندگی رہے گی تو تم جیو گے۔ ورنہ اپنے گرو کی پیش گوئی کے مطابق مر جاؤ گے۔“

اس نے رے کو مضبوطی سے شاخ کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کا گریبان پکڑ کر وہاں لے آیا اور رے کا پھندا بناتے ہوئے بولا ”اگر میں یہ پھندا تمہارے گلے میں ڈالوں گا تو تمہیں پھانسی نہیں لگے گی کیونکہ برف کے تودے پر کھڑے ہوئے ہو۔ تم اس وقت تک زندہ رہو گے۔ جب تک تمہارے قدموں کے نیچے سے برف نہیں پگھلے گی۔“

اس نے رسیوں سے پہلے اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر باندھا پھر گلے میں پھندا ڈال کر اسے پوری طرح کس دیا۔ وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا ”میری سانس رک رہی ہے۔“

”جب تک برف نہیں پگھلے گی۔ تب تک سانس نہیں رکے گی۔ گلے میں پھندا پڑا رہے گا۔ تم آرام سے کھڑے رہو گے۔“

شاداں اس کے سامنے اسے نشانے پر لیے کھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے وہاں سے بھاگنے کی جرات نہیں کی تھی۔ چپ چاپ گلے میں پھندا پہن لیا تھا۔ ایسا نہ کرتا تو وہ اسے زخمی کر کے پھانسی پر چڑھاتے۔ موت کو کسی طرح بھی آنا تھا لیکن برف پر کھڑے رہنے سے فوراً آنے والی موت ٹل رہی تھی۔

شاداں اور کبریا اس سے ذرا دور آکر کھڑے ہو گئے۔ بستی والے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ برف کے تودے پر سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اگر نجات پانے کی کوشش کرنا چاہتا تو پھندا سخت ہو جاتا۔ وہ خوف سے دیدے پھیلانے شاداں اور کبریا کو اور بستی والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھندے کے باعث کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

ایسے وقت تین مجاہدین وہاں آ گئے۔ انہوں نے کبریا کو پہچان لیا۔ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے خیریت سے واپس آنے کی مبارک باد دی۔ کبریا نے اپنے بیگ سے ویڈیو فلم

نکال کر ایک بزرگ مجاہد کو دیتے ہوئے کہا ”یہ بہت اہم کیسٹ ہے۔ آپ اسے رکھیں۔ میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گا۔“

پھر اس نے جبار جان کے بارے میں انہیں بتایا۔ انہوں نے کہا ”اسے ایسی ہی سزا ملنا چاہیے۔ ایسے شیطان نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔“ پھر ایک مجاہد نے کہا۔

”اے ساری زندگی مسلمان بن کر رہا۔ آخری وقت کلمہ پڑھ لے۔ موت آسان ہو جائے گی۔“

وہ کلمہ کیا پڑھتا۔ اس کے سر پر تو موت ناچ رہی تھی۔ اس کے سامنے آسمان پر بادلوں کے پیچھے سے دھوپ نکل رہی تھی۔ قدموں تلے بہت آہستہ آہستہ برف پگھل رہی تھی۔ جیونشی کی پیش گوئی کے بعد وہ اب تک زندگی اور موت کے درمیان تھا لیکن خوف زدہ نہیں تھا لیکن اب اس طرح درمیان میں لٹک رہا تھا کہ پیش گوئی پوری ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ قدموں تلے آہستہ آہستہ برف پگھل رہی ہے اور کہیں کہیں سے ٹوٹ رہی ہے۔

اچانک کبریا لڑکھڑا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شاداں نے اسے تھام لیا۔ اسے زمین پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”حوصلہ کرو۔ تم بیماری سے لڑتے آرہے ہو۔ اب بھی اس پر غالب آ جاؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

وہ بول رہی تھی مگر اسے دنیا کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے تمام منظر بجھ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی ریگ مال سے اس کے دماغ کو رگڑ رہا ہو۔ وہ دانت پر دانت جمائے ایسی تکالیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سر پر موت ناچ رہی تھی اور زندگی بھی ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔

”اے رقص اجل! ذرا تھم۔ ذرا دم میں آئے دم۔ خدا را ذرا تھم۔“

ایک کڑا کے کی آواز سے برف ٹوٹی۔ جس طرح پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ اسی طرح برف نکل گئی ادھر دم نکلا۔ ادھر شاداں نے اس کے سر کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اپنی دھڑکنیں سنانے لگی۔ زندگی کی سب سے خوب صورت اور سب سے مترنم آواز دل کی دھڑکن ہے۔

”رہا! بس ایک آخری دعا۔ میری دھڑکنیں میرے یار کو دے دے۔“

(کیا دعا قبول ہوگی؟)

